بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

حیات نو

مارچ ۱۹۹۶ء

مدیر مسئول:۔ ابوالمکارم فلاحی

مدیر:۔ طارق فارقلیط فلاحی

قیمت فی شمارہ:۔ ۲ روپے ۵۰ پیسے

سالانہ تعاون:۔ ۲۵ روپے

ترسیل زر کا پتہ:۔ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۱۲۱

نقوش حیات نو

		صفحہ نمبر
اداریہ		
بابری مسجد کا سانحہ	ایڈیٹر	۳
انٹرویو		
مدیر تکبیر پاکستان سے ایک انٹرویو	ابوسفیان اصلاحی	۹
مقالات		
مسلم پرسنل لا۔ ماضی حال اور مستقبل	مقبول احمد فلاحی	۱۵
اجودھیا کی بابری مسجد	ماخوذ	۲۶۰
سخن در سخن		
ڈاکٹر اشفاق احمد کا انٹرویو	پروفیسر عبدالغنی	۳۰
جہاد کے میدان سے		
گلبدین حکمت یار سے ایک اہم گفتگو	رفیق افغان (پاکستان)	۴۰
شعر و نغمہ		
غزل	عزیز بگھروی	۴۵
غزل	عزیز الدین عزیز	۴۶
غزل	ملک عطاء اللہ عطا	۴۹
غزل	شفق طاہری	۵۱
غزل	نورالدین انور	۵۱
تعارف و تبصرہ	آل م	۵۲
حلقہ یاراں	عزیز الدین عزیز ۔ ط ۔ س	۵۴
جامعہ کے لیل و نہار	نور محمد فلاحی سکریٹری انجمن	۵۶

اداریہ

بابری مسجد کا سانحہ

نہ سوچو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندی مسلمانو !!

فروری ۱۹۸۶ء کی پہلی تاریخ ہندی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سیاہ باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دن حکومت کے طاقتور ہاتھوں نے فورس، پریس اور نام نہاد عدلیہ کی مدد سے ایک ایسی مسجد کو اکثریت کے حوالہ کر دیا، جو پانچ سو سال تک سجدہ گاہ رہی ہے اور جسکے در و بام نغمہ توحید سے صدیوں تک معمور رہے ہیں۔ جہاں خدا کی بڑائی اور بزرگی کے گیت گائے گئے ہیں اور جہاں بار بار پیشانیاں جھکی ہیں۔ حکومت اور اکثریت کا اتنا بڑا زخم مسلمان بھول نہیں سکتے اور رہتی دنیا تک یہ کبھی مندمل نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعلق تاریخ کے ان واقعات سے ہو گیا ہے جس کی تعبیریں قوت و اقتدار کے زمانے میں کچھ اور ہوتی ہیں اور کمزوری اور محکومی کے زمانے میں کچھ اور، اور یہ دونوں حالتیں افراد، قوموں اور حکومتوں کے ساتھ کچھ اس طرح لگی ہوئی ہیں جیسے رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات، حکومت ہند کو قدرت کے اس اصول کو نوٹ کر لینا چاہیئے۔

اجودھیا کی یہ مسجد — جس کو بابری مسجد کہا جاتا ہے درحقیقت بابر کی بنوائی ہوئی نہیں ہے۔ بابر تو اجودھیا کبھی آیا ہی نہیں۔ اس کو میر باقی نے بابر کی خوشنودی کے لئے ۱۵۲۸ء میں بنایا تھا۔ اس مسجد میں جو سنگی تختی لگی ہوئی ہے۔ اس میں صاف طور سے لکھا ہوا ہے، کہ مسجد کی تعمیر شیخ باقی نے کرائی تھی، تختی پر کندہ عبارت یہ تھی،

"بحکم شہنشاہ بابر جس کا انصاف چرخ گردوں تک پہنچ گیا ہے نیک دل میر باقی نے فرشتوں کے اس آشیاں کو تعمیر کرایا خیر یہ ہمیشہ باقی رہے۔ اور اس کی تاریخ — "بود خیر باقی" یعنی ۹۳۵ھ ہے"

"تفصیل کے لئے دیکھئے مضمون، اجودھیا کی بابری مسجد"

بابر نیک دل، رعایا پرور اور انصاف پسند حکمراں تھا۔ اس پر یہ الزام کہ اس نے مندر توڑ کر مسجد بنوایا، سراسر بے بنیاد اور جھوٹ ہے۔ اس نے تو اپنے بیٹے ہمایوں کو وصیت کی تھی کہ گائے کا گوشت کھانا ترک کر دو تاکہ رعایا کے دل جیت سکو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ مندروں اور مذہبی عبادت گاہوں کو دیکھنے جایا کرتا تھا جیسے آجکل کے سیکولر لیڈران کرتے ہیں۔

یہ مسجد ۱۵۲۸ء سے ۱۹۴۹ء تک مسلمانوں کے قبضے میں رہی اور اس میں باقاعدہ نماز پڑھی جاتی رہی اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جاتی رہی لیکن ۲۲،۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی شب اجودھیا کے ہنومان گڑھی مندر کے مہنت ابھے رام داس اور ان کے کچھ ساتھیوں نے پولیس، ضلع مجسٹریٹ اور کلکٹر کے زیر مدد اور تعاون سے مسجد کے ایک حصہ میں رام چندر جی کی مورتی نصب کر دیا۔ اور ۲۳ر کی صبح اعلان کر دیا کہ رام جنم مندر کو اس کی پرانی شکل میں بحال کر دیا گیا ہے۔"

مسلمانوں کی صدائے احتجاج پر کلکٹر کے زیر دفعہ ۱۴۵/۱۴۶ کے تحت مسجد کو قرق کر لیا اور اس پر تالا لگا دیا بلکہ دو سو گز کے ایریے میں مسلمانوں کے داخلہ پر پابندی بھی ڈال دی اور مورتی کی پوجا کے لئے ایک سرکاری پجاری بھی مہیا کر دیا۔ مسلمانوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اس وقت سے آجتک ۳۵ برس بیت گئے مگر مقدمہ کا فیصلہ نہ ہوا۔ مقدمہ ہائی کورٹ میں اب بھی زیر غور ہے۔

عدالت کیا فیصلہ کرے گی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اتنا تو ضرور ہی کہا جا سکتا ہے اور محسوس کیا جا سکتا ہے کہ عدالت بھی اکثریت کی ہے ایڈمنسٹریشن بھی اکثریت کا، پولیس فورس اور پی اے سی، وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم سب اکثریت کے ہیں۔ اکثریت کے جذبات ان کے جذبات ہیں چنانچہ اکثریت کے جذبات کی عکاسی ہر جگہ نمایاں ہے، پھر بھی صبر نہ ہو سکا۔ حکومت کے تعاون، مدد اور اشارے پر پورے ملک میں بابری مسجد پر قبضہ کرنے کی ایک مہم چلائی گئی، وعدے کئے گئے، قسمیں کھائی گئیں اور تالا توڑ دینے کی دھمکی دی گئی اور پھر فیض آباد ضلع اور سیشن جج نے مقامی وکیل مسٹر امیش چندر پانڈے کی درخواست پر

تالا کھول دیا اور پوجا پاٹ کی اجازت دے دی۔

سیشن کورٹ میں صرف گیارہ دن کی قلیل مدت میں ایک ایسے کیس کا فیصلہ جو ہائی کورٹ میں ۳۵ سالوں سے پڑا ہوا ہو، تعجب خیز بھی ہے اور حیرت انگیز بھی، اور اس سے زیادہ حیرت انگیز فیصلہ کا نفاذ اور پی اے سی کی ۱۳ کمپنیوں کی تعیناتی ہے۔ انصاف کو آواز دو ....؟

پنجاب اور ہریانہ میں ۹۶۲۰ مسجدیں، کلکتہ میں ۹۵ مسجدیں اور دلی میں ۹۳ مسجدیں غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں۔ ایسے ہی نہ معلوم اور کتنی مسجدیں ہیں جو آثار قدیمہ قرار دے کر بند کر دی گئی ہیں۔ نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن بابری مسجد مسلمانوں سے جس انداز سے چھینی گئی وہ اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ہے۔ پھر ہندی اور انگریزی پریس ریڈیو اور ٹی وی نے اس کو جو رخ دیا اور جس طرح اچھالا وہ مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا۔ پھر ہندو بھائیوں نے خوشیاں منائیں، مٹھائیاں تقسیم کیں اور چراغاں کئے، جلوس نکالے اور مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی۔

مسلمان اس پر تڑپ اٹھے، بے چین ہو گئے۔ کیونکہ یہ شعائر اللہ کی بے حرمتی تھی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ بھیانک مذاق تھا اور ان کے امتیاز اور تشخص پر کاری ضرب تھی انھوں نے شدید غم اور غصے کا اظہار کیا، اپنی دکانیں بند کر دیں، گھروں پر سیاہ جھنڈے لہرائے کالی پٹیاں باندھیں اور سڑکوں پر نکل آئے۔ مسلمانوں کا پر امن طریقے سے اپنے جذبات کا اظہار کرنا دستوری بھی تھا اور جمہوری بھی، لیکن واہ رے ہماری حکومت، مارے اور رونے بھی نہ دے کے مصداق بدنام زمانہ پولیس اور پی اے سی کے ذریعہ گھروں کی تلاشی لی، آنسو گیس داغے، گولیاں چلائی اور گرفتار کر کے جیلوں میں بھر دیا۔ کتنا اچھا سلوک کیا اور کتنا پیارا برتاؤ کیا ہمارے ساتھ!

آج کا ہندوستان ہمارے خوابوں کا ہندوستان نہیں ہے جس کو ہم نے اپنا خون بہا کر اور انتھک جدوجہد کر کے آزاد کرایا تھا اور جو ۳۸ سال پہلے تھا، ہمارا ہندوستان

کتنا بدل گیا ہے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے، ہماری زبان اردو کو قتل کر دیا گیا تھا اور ہم کو رونے بھی نہیں دیا گیا پھر ہم سے کہا گیا کہ اس کو دفن کر آؤ اور خبردار آنسو نہ بہانا، اور ہم نے اس کو اپنے ہی کندھوں پر رکھ کر دفن کر دیا۔ پھر فسادات کے ذریعہ ہم کو ہر جگہ تباہ کیا گیا، ہماری دوکانیں جلائی گئیں، گھر پھونکے گئے، ہمارے بچوں کو سنگینیں بھونکی گئیں، نوجوانوں کو قتل کیا گیا، عورتوں کو بے آبرو کیا گیا۔ ہم کو دوسرے درجے کا شہری ہونے کا احساس دلایا گیا اور الزام بھی دھرا گیا کہا گیا جرم تمہارا ہے، تم کیوں ترقی کرنا چاہتے ہو، آگے بڑھنا چاہتے ہو، ہندوستان میں رہنا چاہتے ہو تو ہماری خدمت کرو۔

نوٹی پولیس میدان میں آیا، اسلام اور مسلمانوں کا مذاق اڑایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر توہین آمیز مضامین لکھے گئے، قرآن پر پابندی ڈالنے کے لئے مقدمہ دائر کیا گیا، مسلم پرسنل لا کے خلاف فیصلہ کیا گیا، قرآن کی غلط تعبیر کرائی گئی اور طاقت اور قوت کے ذریعہ یکساں سول کوڈ بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ مسجدوں پر قبضہ کیا گیا اور خوشیاں منائی گئیں۔ ہندوستان تو کدھر جا رہا ہے، کیا دار الحرب کی طرف، لڑائی اور جھگڑے کی طرف، شورش اور بدامنی کی طرف؟ کیا اب امن کا زمانہ ختم ہو گیا؟ کیا اب ٹیررسٹ بنے بغیر اپنے جان و مال عزت و آبرو، دین و مذہب کی حفاظت ناممکن ہو گئی ہے؟ حکمرانوں تم ہم کو کدھر لئے جا رہے ہو؟

آج ہندوستان کا ہر مسلمان پریشان ہے، بے چین ہے، فکر مند ہے، وہ سوچ رہا ہے کہ ہندوستان میں ہمارا مستقبل کیا ہے، ہمارے بچوں کا مستقبل کیا ہے؟ ہمارا دین، ہمارا ایمان، ہماری مسجدیں، ہماری درسگاہیں، ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، ہمارا ورثہ، ہمارا تشخص کیسے باقی رہے گا؟ ہم عزت اور امن کی زندگی کس طرح گزار سکیں گے؟ اور کل ہمارے ساتھ کیا ہوگا۔ ایسے اور اسی طرح کے سوالات آج ہر مسلمان کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں سے، لیڈروں سے، سیاستدانوں سے، علماء سے اس کا جواب چاہتے ہیں، ایسا جواب جو ان کو مطمئن کر سکے، ان کی عزت و آبرو دین و مذہب کی ضمانت دے سکے اور مستقبل کو تابناک اور روشن بنا سکے۔ ہم نے بھی ان سوالوں پر بارہا سوچا، غور کیا، لوگوں سے گفتگو کی اور اس نتیجہ پر

پہنچا کہ ہندوستان کے یہ حالات عارضی نہیں ہیں اور نہ ہی وقتی اور نہ ہی کسی ایک سیاسی یا مذہبی جماعت یا پارٹی کے پیدا کردہ ہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک منصوبہ ہے، ایک پلان ہے اور اس منصوبے اور پلان کے تحت یہ بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ شاہ بانو کیس اور بابری مسجد کا سانحہ اس منصوبے اور پلان کی ابتدائی شکلیں ہیں، اس کی انتہائی شکل وہ ہوگی جبکہ یہاں مسلم پرسنل لا ختم کر دیا جائے گا، مدرسے توڑ ڈالے جائیں گے، مسجدیں یا تو قبضہ کر لی جائیں گی یا تالا لگا دیا جائے گا، اور اکثریت کی تہذیب میں ہم کو ضم کر دیا جائے گا۔ اگر ہم سخت جان ہونگے تو مراد آباد، حیدرآباد، احمد آباد، اور دہلی کی تاریخ دہرائی جائے گی اور یہ بیک وقت کئی کئی شہروں میں ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور ایسا کیوں ہوگا؟ اس کا سیدھا جواب تو یہ ہے کہ ہندوستان کی پراچین سنسکرتی اس کی متقاضی ہے۔ اور اس کا تفصیلی جواب یہ ہے کہ ہندوستان میں جتنے لوگ آئے اور جتنے مذاہب آئے وہ یہاں کے قدیم ہندو مذہب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، یا تو انھوں نے اپنے آپ کو ہندو مذہب میں ضم کر دیا یا ہندو مذہب کو وسعت دے کر اس قابل بنا دیا گیا کہ وہ اس میں شامل ہو سکیں۔ مثلاً بدھ دھرم، جین مت، سکھ مت، یہ پہلے ہندو دھرم سے الگ تھے مگر اب اس دھرم کی وسعت میں سما گئے ہیں بلکہ ہندوستان کی عیسائیت بھی اپنی تبلیغی فکر کے تحت ہندوستانی قالب میں ڈھل گئی ہے صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہندو دھرم سے اثرات قبول کرنے کے بجائے اثرات ڈالنے میں کامیاب رہا اور یہاں کے ہزاروں لاکھوں باشندوں کو توحید کی روشن شاہراہ سے روشناس کرایا، اپنی فطری پکار، طاقتور عقیدے اور صحیح طرز فکر کی وجہ سے جہاں بھی گیا ایک الگ پاکیزہ اعلیٰ اور بہترین تہذیب و تمدن کی حیثیت سے ابھرا اور خود ہندوستان میں بھی۔ اور یہ چیز پراچین ہندی سنسکرتی کے ماننے والوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی، پہلے تو انھوں نے کوشش کی کہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے مگر اب تشدد اور جبر پر اتر آئے ہیں۔ اور یہ بہت جلد ختم ہونے والا نہیں ہے، یہ "من تو شدم اور تو من شدی" کا معاملہ ہے اور خطرہ ہمارے تشخص اور وجود کا ہے۔ اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ حالات کتنے سنگین ہیں اور ہم

کس درجہ کا سنجیدہ غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔

بات اب مظاہروں کی نہیں ہے، کالی پٹیوں اور کالے جھنڈوں سے بھی کام نہیں چلے گا
غم و غصہ، مایوسی، جھنجلاہٹ، نامرادی اور بزدلی سے بات اور بگڑ جائے گی اور اس کی کوئی
وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ تاریخ میں ایسی تاریک راتیں بارہا ہم پر آئی ہیں اور کالے بادلوں نے بار
بار ڈرایا ہے، بجلیاں بھی کوندی ہیں اور طوفان بھی اٹھے ہیں لیکن ہم خدا کے فضل سے اپنے
آپ کو بچانے اور اپنی کشتی کو پار لگانے میں کامیاب رہے ہیں، خدا کے سہارے ہم کو یہاں
بھی عزم و ہمت سے آگے بڑھنا ہے اور ہر طرح کے مصائب اور مشکلات کو انگیز کرتے ہوئے
اپنے لئے راہیں پیدا کرنی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی چیز یہ ہے کہ:

- حالات کا سنجیدگی اور گہرائی سے جائزہ لیتے رہیں کہ کوئی کہیں ہم کو غلط راہ پر نہ ڈال دے۔
- اپنا احتساب کریں، اپنے اوپر اور اپنے اہل و عیال اور معاشرے کے اوپر اسلام کو حکمت اور موعظت سے جاری و نافذ کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔
- معاشرے پر نظر رکھیں اور دیکھیں کہ دراڑیں کہاں کہاں ہیں اور کمزوریاں کس کس طرح کی ہیں اور انہیں دور کرنے کی کوشش کریں۔
- پوری قوم ایک ہو، ایک ملت بن جائے، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، تبلیغی، جماعت اسلامی، کانگریسی، جمعیتی، مسلم لیگی اور مجلسی کے فرق و امتیاز کو ختم کیا جائے اور ایک امت وسط کی حیثیت سے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو۔
- ہندی امت وسط کے دو شعبے بنائے جائیں ایک حکومت وقت سے پر امن جمہوری اور دستوری حق طلب کرے اور اس کے لئے جدوجہد کرے، جدوجہد کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں مثلاً عدالت، پریس، سیاسی پلیٹ فارم وغیرہ۔
- امت وسط کا دوسرا شعبہ اپنے ملی اور مذہبی کردار کو ادا کرنے اور اسلام کے پیغام کو پہنچانے کی جتنی شکلیں ممکن ہو سکتی ہیں اختیار کرے ۔ اور ہر فرد اور ہر گھر پر دستک دی جائے اور ان تک اسلام کے پیغام کو پہنچایا جائے۔ انشاء اللہ مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔

خدا ہمارا حامی و ناصر ہو اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

3
طارق نثار تلیط (؟)

صلاح الدین صاحب سے ایک انٹرویو

ادھر جون میں ایک بار پھر پاکستان جانے کا موقع ہاتھ آیا، اس بار تین مہینے صرف کراچی میں بسر ہوئے، اس دوران کراچی شہر کے متعدد شخصیات سے گفتگو رہی، ان میں سے بہت سے لوگوں کا انٹرویو لیا۔ علماء دین میں جناب صلاح الدین صاحب (مدیر ہفت روزہ تکبیر سابق اڈیٹر جسارت اخبار کراچی)، نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان جناب پروفیسر غفور صاحب اور مشہور شاعر لکچرار جناب مظفر حسن صاحب سے ملاقاتیں رہیں، ادباء و شعراء میں مشہور شاعرہ پروین شاکر، عبید اللہ علیم اور روزنامہ جنگ کے مشہور کالم نگار و بہترین شاعر جمیل الدین عالی سے ملا۔ یہاں ہم صلاح الدین صاحب کا انٹرویو پیش کر رہے ہیں۔

ابوسفیان اصلاحی

س۔ جسارت کی ادارت سے آپ منسلک ہوئے اور کیوں سبکدوش ہو گئے؟

ج۔ جسارت کی ادارت میں شریک ہونے والا میں سب سے پہلا رکن تھا یکم اپریل ۱۹۷۰ء کو وابستہ ہوا، اور پھر دوسرے تمام افراد مئی ۱۹۷۰ء سے جسارت سے وابستہ ہوئے، میری وابستگی بحیثیت نیوز ایڈیٹر تھی اور بھٹو صاحب کے اقتدار سنبھالنے سے صرف دس دن پہلے مجھے اداری ذمہ داریاں سونپی گئیں اور اس کے بعد میں ۳۱ دسمبر ۱۹۸۲ء تک مدیر رہا اس طرح مجموعی طور پر میں نے جسارت میں ۱۳ سال گزارے اس میں سوا دو سال کا عرصہ جیل میں گزارا کچھ عرصہ اخبار بند رہا۔

سبکدوشی کا ایک سبب یہ کہ جس تحریک کا وہ اخبار ہے اس سے میرا اختلاف نہیں تھا لیکن انتظامیہ کمیٹی سے میرا بعض امور میں اختلاف ہوا، بدقسمتی سے اختلاف میرا ذاتی نہیں تھا بلکہ کچھ ذاتی اقدار تھیں جن سے محسوس کرتا تھا کہ میری ذمہ داری یہ ہے کہ اخبار کو مرکز کی پالیسی سے ہم آہنگ رکھوں، کیوں کہ پورے پاکستان میں یہ اخبار تحریک اسلامی کا ترجمان ہے، یہی میرا اختلاف تھا جو بدقسمتی سے دور نہ ہو سکا۔

س ۔ ابتک نفاذ اسلام کے باب میں پاکستانی صحافت کا کیا رول رہا۔؟

ج ۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ نفاذ اسلام ہی کے لئے پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا لیکن بعد میں نہایت سنجیدگی سے اس طرف قدم نہ بڑھا سکے لیکن ہم نے یہ محسوس کیا کہ یہ دور رائے عامہ کا دور ہے، تمام فیصلے رائے عامہ کے مطابق اٹھیں اس لئے اخبارات کے محاذ پر پاکستان کے جو لوگ قابض تھے زیادہ بڑی تعداد اشتراکیوں کی تھی اور اسلام پسند لوگ ایکا دکا ادھر ادھر ملتے تھے، وہ غیر موثر تھے تو ہم نے اس بات کی کوشش کی کہ اثر و رسوخ پریس میں بڑھانے کے لئے جتنے ادارۂ صحافت ہیں ان میں زیادہ سے زیادہ اپنے افراد شامل کئے جائیں ان کا آغاز ۱۹۵۵ء والا جو عشرہ ہے اس کے درمیان کا ہے۔ اس میں اس کا آغاز ہوا اور ۱۹۶۰ء تک پہنچتے پہنچتے خدا کے منظور سے ہماری تعداد اتنی ہوگئی کہ پاکستان میں ایک موثر آواز بنکر ابھرے، اس میں سب سے پہلے جس کا نام لینا چاہوں گا وہ الطاف حسن قریشی ہیں ان کا ہفت روزہ رسالہ "زندگی" صحافت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اخبارات کو لیجئے تو جنگ، حدیث اور مشرق میں ہمارے افراد پہنچے اور خبر رساں ایجنسیوں میں بھیجے گئے ہمارے افراد گھسے، ہمارا نقطۂ نظر اخبار میں آنے لگا، اسکے بعد جسارت جو باقاعدہ تحریک کا اخبار تھا ۱۹۷۰ء میں ملتان سے نکلا اور اسکے بعد وہاں سے آفس کراچی منتقل ہوگیا، ہمارے شعبۂ صحافت سے جو افراد فارغ ہو کر آتے ہم انہیں جگہ دیتے اور اگر جگہ نہ ہوتی تو کہیں انکی تقرری کا نظم و نسق کرتے، اس طرح محب اسلام صحافیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد وجود میں آگئی، ایک زمانہ یہ تھا کہ یہاں پوری صحافت پر اشتراکیوں کا قبضہ تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ دوسری پوزیشن میں ہیں اور اسلام پسند جرنلسٹ پہلی پوزیشن میں

تو یہ تعداد کا تناسب ہے۔

س ۔ ہفت روزہ "تکبیر" آپ نے کن پہلوؤں کے مدنظر نکالنا شروع کیا؟

ج ۔ اسکے سارے پہلو خود اسکے عنوان میں موجود ہیں۔ تکبیر ہم نے بلندی دینے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس عنوان کے بعد اس سوال کے پوچھنے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی، اسکے افکار اور مقاصد عنوان ہی میں مخفی ہیں۔ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا اور اسکے پیغام کو عام کرنا اسے دوسروں تک پہنچانا، اسلام دشمن قوتوں کے خلاف آواز بلند کرنا، انکے خلاف جہاد کرنا اور اس ملک میں نفاذ اسلام کے لئے جدوجہد کرنا یہی اسکے مقاصد ہیں اور سب اسکے عنوان سے چسپاں ہیں۔

س ۔ آپ نے اپنی کتاب "بنیادی حقوق" کن وجوہات کی بناء پر تالیف کی اور ابتک کتنی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں؟

ج ۔ اس کتاب کا خیال ایک دلچسپ واقعہ کی وجہ سے ہے۔ مجھے جب پہلی بار جیل بھیجا گیا تو وہاں جانے سے قبل ایک ہنگامے کے دوران ساری کتابیں نذر آتش ہوگئیں، جب میں نے وہاں جیل سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ پڑھنے کے لئے کوئی کتاب دیجئے تو انھوں نے کہا کہ ساری جل گئی ہیں، لیکن دیکھتا ہوں شاید کوئی بچی ہو تو انھوں نے لاکر مجھے ایک کتاب دی۔ یہ کتاب امریکہ کے چیف جسٹس مسٹر ولیم ڈگلس کی تھی اس کا نام (ہیومن رائٹس ان یونائیٹڈ اسٹیٹس)[۱] اس کو میں نے جیل میں پڑھا اور جیل ہی میں پڑھنے کے بعد خیال کیا کہ امریکہ انسان کے بنیادی حقوق کے تحفظ میں سب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے، لیکن اسکے دستور میں ایسی دفعات ہیں کہ بنیادی حقوق ایک تماشہ بنکر رہ گیا ہے، اس وقت مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اسلام کے بنیادی حقوق پر ایک کتاب تالیف کی جائے بدقسمتی وہاں میرے پاس کاغذ قلم موجود نہ تھا، کتاب منگانا ممنوع تھا، تفہیم کی جلدیں موجود تھیں وہ بھی مجھے عدالتی حکم کے ذریعہ ملی تھیں، پہلے وہ بھی روک دی گئی تھیں، پہلے میں نے اس سے کچھ مواد فراہم کیا، کچھ احادیث سے اٹھایا گیا۔ لکھنے کا مسئلہ تھا کیونکہ کاغذ قلم نہیں رکھ سکتے تھے، اس لئے مطلوبہ جگہوں پر نشان لگائے گئے۔

ف۱ (Human Rights in United states)

پھر ہم لوگوں کو وقفہ وقفہ سے رہائی اور گرفتاری ہوتی رہی اس طرح تحریر کا کام کچھ جیل اور کچھ جیل سے باہر ہوا، ویسے کتاب کی تکمیل تو جیل میں ہوئی۔ ہمارے یہاں کے مشہور وکیل خالق صاحب کی لائبریری میں میں نے اس کے تقریباً تین سو کتابوں کا مطالعہ کیا، اس میں فارسی، انگریزی اور عربی و اردو کی کتب تھیں، یہ کتاب آٹھ آدمیوں کی نظروں سے گزری، خود خالق صاحب نے اسکے قانونی پہلوؤں کا جائزہ لیا، مولانا ماہر القادری صاحب نے اسکی زبان دیکھی الحمد للہ انھوں نے اسکی بہت تعریف کی اور کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی، جناب الطاف گوہر صاحب نے اسے انٹرنیشنل لا اور دوسرے حوالوں سے دیکھا اور پھر ظفر احمد انصاری صاحب نے دیکھا یہ ہمارے ملک کے بہت بڑے دستور ساز ہیں کوئی ایسا دستور نہیں ہے جو انکی نظر سے نہ گزرا ہو انھوں نے اسے غور و خوض سے دیکھا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسے دیکھا اور الطاف حسن قریشی صاحب نے اسے دیکھا تو اس طرح یہ کتاب زبان کے لحاظ سے انٹرنیشنل لا کے لحاظ سے اور جتنے بھی پہلو اس کتاب کے تھے معروف لوگوں کی نظروں سے گزرے، اسکے ابتک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ انڈیا میں بھی شائع ہو چکی ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی تیار ہے جس کو ایک علی گڑھ کے صاحب نے کیا ہے یہ صرف چھپنا باقی ہے اور عربی میں اس کا ترجمہ عاصم الحداد صاحب کر رہے ہیں جو اس وقت مکہ معظمہ میں مقیم ہیں، تہائی کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے چونکہ مولانا مودودیؒ نے لکھا تھا کہ اس کا ترجمہ دوسری زبان میں ہونا چاہیئے تو اسکے تحت یہ ترجمہ ہو رہا ہے یہ کتاب ابتک غالباً تیس ہزار سیل ہو چکی ہے، کراچی یونیورسٹی کے ایک کورس ایل ایل ایم میں بحیثیت نصاب کے داخل ہو رہی ہے۔

اسکے بعد میں نے مزید تین کتابیں لکھی ہیں ایک ہے، انقلاب ایران کیا کھویا اور کیا پایا، اور ایک کتاب کلمہ طیبہ پر ہے اور ایک پیپلز پارٹی مقاصد اور حکمت عملی، اس طرح تو کتابیں چار ہیں، دو کتابیں تیار رکھی ہیں۔ مقدمہ بھی لکھے جا چکے ہیں ایک انڈونیشیا پر ہے اور دوسری چین پر ہے، چونکہ میں وہاں کا سفر کر چکا ہوں اس لئے میں نے وہاں جو کچھ دیکھا تھا اور جو واقعات پیش آئے اسے قلمبند کیا ہے تو یہ ان دونوں ملکوں کا تعارف اور میرا سفرنامہ ہے بالخصوص وہاں کے نظام پر گفتگو ہے۔

س۔ پی ٹی وی (پاکستان ٹیلی ویژن) کے ملک و ملت پر کیا اثرات ہیں؟

ج۔ اسکے وہی اثرات ہیں جو اثرات دوسرے ممالک پر ہیں، سب سے زیادہ نقصان یہ پہنچا ہے کہ اس سے ہماری معاشرتی اور تعلیمی زندگی بری طرح متاثر ہے، معاشرتی زندگی میں لوگ مل کر بیٹھنے اور تبادلہ خیال کرتے ہیں، مجلسی گفتگو کا جنازہ نکل چکا ہے کیونکہ اس نے اسکرین screen سے چپکا کر سب کو الگ الگ تقسیم کر دیا ہے اسی لئے باہمی گفتگو نہیں ہو پا رہی ہے، ہماری اجتماعی زندگی دم توڑ رہی ہے، ہمارے بچوں کا جو عصر سے لیکے رات تک تعلیمی وقت ہے اسے ٹی وی نے کیپچر کر لیا جسکی وجہ سے ہمارا تعلیمی نظام سخت متاثر ہوا تیسری خرابی یہ ہے کہ ٹی وی تو ہم نے ضرور لگا لیا لیکن اس کا Feeding Matterial خود تیار نہیں کرتے اس کو باہر سے منگایا جاتا ہے، اس لئے ہم اپنے افکار و خیالات اور رجحانات کو پیش نہیں کر پاتے۔ گزشتہ چند برسوں سے ہم نے اپنے طور پر کچھ ڈرامے، افسانے اور دیگر تعمیری پروگرام تیار کئے ہیں۔ اسکے باوجود باہر سے لائے ہوئے پروگرام کے بڑے برے اثرات پڑ رہے ہیں، سب سے تباہ کن اثر جو ہماری سوسائٹی پر پڑا ہے وہ یہ ہے کہ ٹی وی اشتہارات کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے، اشتہارات کی بھرمار نے لوگوں کے اندر مسرفانہ زندگی کے رجحانات پیدا کئے اور ہر شخص کے اندر ایک جنونی خریداری پیدا کیا کہ وہ ایک اعلیٰ مکان میں رہے، اسکے پاس ایک اچھا ٹی وی ہو، اسکے پاس فریج ہو، نئے ماڈل کی کار ہو، دنیا میں اچھی سگریٹ کا کش لگا سکے، عمدہ قسم کی چائے پی سکے اور عمدہ قسم کی کراکری خرید سکے، اب ٹی وی جن گھرانوں میں موجود ہے انکے پاس اتنے وسائل تو نہیں ہیں جو انکی ضروریات پوری کرنے کے لئے درکار ہیں۔ ہر شخص کے اندر اس نے سادہ زندگی کے بجائے شاہانہ اور مسرفانہ زندگی کے رجحانات پیدا کئے جو اخلاقی حیثیت سے ایک بری شئی ہے، اسکی وجہ سے لوگ ناجائز اور رشوت لینے پر آمادہ ہو گئے چونکہ اسے خاندان دیکھنا ہے فرد نہیں، کہیں بچے کی ضد کا مسئلہ آتا ہے تو کہیں بیوی کا، بیٹے کو خاص قسم کا پہننے کے لئے کپڑا چاہیئے چلانے کے لئے خاص قسم کی کار چاہیئے، اسے کھلونے، ٹائیاں اور آئس کریم چاہیئے۔

کیپچر Capture (گرفت)

اس نے Family کے ہر فرد پر جنون طاری کیا ہے کہ اسے کچھ نہ کچھ چاہیئے۔ ہمارے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ٹی وی کیو جیسٹ کا استعمال کئی گنا بڑھ گیا ہے، پہلے گھر میں ہم ایک سالو سا نجی استعمال کر لیتے تھے۔ تو ٹی وی کا بیشتر فائدہ ملک کے ساہو کار اور صنعت کار کو ملتا ہے۔ اب آدمی کے اندر خریدنے کی استطاعت نہیں ہے تو اسے ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

س۔ افغان مجاہدین کے کیا جذبات ہیں؟

ج۔ انکے جذبات تو نہیں ہیں بلکہ ان کا صرف ایک جذبہ ہے وہ جذبۂ آزادی اور باقی سب اسکے تقاضے ہیں۔ وہ غلامی کی زندگی قبول نہیں کرنا چاہتا اسکے بہت سے پڑوسی ممالک مثلاً ایران غیر ملکیوں کے قبضہ میں جا چکا ہے، چین پر بھی دوسروں کا غلبہ ہو چکا ہے، روس کا علاقہ ترکستان بھی غیر ملکیوں کے ہاتھ میں گیا اور پاکستان پر بھی دوسروں کا اقتدار رہا۔ واحد جزیرہ جسے آج تک کوئی زیر نہیں کر سکا، انگریز نے بھی ہتھیار یہیں آ کر ڈالے ہیں۔ اعلان کر دیا تھا کہ افغانستان کو اسکے حال پر چھوڑ دیا جائے، افغانی قوم کے حوصلے ایسے ہیں کہ وہ کسی کی غلامی برداشت نہیں کر سکتے، افغانستان بہت سی قوموں کی گزرگاہ تو بنا ہے، منگول یہاں سے گزرے تو بغداد تک پہنچے، سکندر یہاں سے گزر کر ہندوستان تک آیا یہ گزرگاہ تو بنا لیکن اپنے یہاں کسی کو قدم جمانے نہیں دیا۔ یہ حریت پسند قوم ہے غلامی پسند نہیں کرتی، آزاد رہنا چاہتی ہے۔ ابھی اگست کے شروع میں وہاں آٹھ روز رہکر آیا ہوں مجاہدین کے ساتھ پورا جائزہ لیا اور انکے بارے میں محاذ پر بھی گن لیکر گیا۔

س۔ تصوف اور تزکیہ میں کیا فرق ہے اگر کہا جائے کہ تصوف "ہندو ازم" یا "بدھ ازم" ہے تو کیا درست ہے، انکے توکل کا خاص مفہوم ہندوؤں سے مشابہ ہے۔

باقی آئندہ

اہل قلم سے گذارش

حیات نو تعمیری قدروں کا علمبردار، علمی، ادبی اور تحقیقی ماہنامہ ہے اس لئے صرف معیاری مضامین اور تخلیقات ہی روانہ کی جائیں نیز خوشخط صفحہ کے ایک طرف لکھکر روانہ کی جائیں بصورت دیگر ہم شائع نہ کر سکیں گے۔

(ادارہ)

مقبول احمد فلاحی

مسلم پرسنل لا۔ ماضی حال اور مستقبل

اس وقت اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف جگہ جگہ جو سازشیں کی جا رہی ہیں اسے دیکھتے ہوئے حضور اکرمؐ کی وہ متفق علیہ حدیث یاد آ رہی ہے جسمیں آپ نے فرمایا تھا، "اسلام بڑی اجنبیت کی حالت میں اٹھا ہے اور آئندہ پھر ایسا دور آئے گا کہ اسلام دوبارہ اجنبی ہو جائے گا تو ایسے ماحول میں وہ لوگ قابل مبارکباد اور خوش قسمت ہونگے جو اسلام پر عمل کرنے اور اسے دوبارہ زندہ کرنے کی جدوجہد میں لوگوں کے درمیان اجنبی ہو جائینگے" اس حدیث کے آخری جملے "فطوبیٰ للغرباء" پر غور کرنے سے اس بات کا واضح اشارہ ملتا ہے کہ بالآخر یہی اجنبی لوگ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے اپنے مقصد میں کامیاب اور عند اللہ فائز المرام ہونگے۔

یہاں پوری اسلامی تاریخ کا جائزہ لینا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی اسکی ضرورت ہے تاہم ہندوستان کی حد تک اسلام اور مسلمانوں کی آمد اور رفتہ رفتہ انکی اجنبیت کا تذکرہ بحث کو سمجھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مختصر تاریخی جائزہ

ہندوستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی تاریخ آٹھویں صدی عیسوی میں سلاطین دہلی کے عہد حکومت سے شروع ہوتی ہے قطع نظر اس کے کہ ان بادشاہوں کی آمد جائز تھی یا ناجائز۔ ان کے مقاصد کیا تھے۔ ان کی زندگیاں کس قدر اسلامی تعلیمات کے مطابق تھیں اور کس حد تک مخالف۔ بحیثیت مجموعی اپنی تمامتر کمزوریوں کے باوجود ان سلاطین نے اپنے دور حکومت میں اسلام اور اسلامی قوانین کی بالادستی کو تسلیم کیا۔ اور ملکی قانون کی حیثیت سے اسے اپنے ملک کے تمام باشندوں پر نافذ کیا۔ نیز مسلم رعایا جو پرسنل لا یا احوال شخصیہ کے دائرے میں آتے تھے ان کا

تصفیہ ان کے مذہبی قوانین (ویدوں اور شاشتروں) کی رو سے کیا جاتا تھا۔ اس دور میں نکاح، طلاق، مہر، نفقہ، وراثت، وصیت اوقاف، شفعہ، ہبہ اور حقوق عائلہ وغیرہ مسلم پرسنل لاء کے تحت آتے تھے۔ ان معاملات میں مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ عدالتوں کے قاضی فریقین کے فقہی مسلک کی بنیاد پر کرتے تھے رفتہ رفتہ مسلم حکمرانوں کی آرام طلبی عیش کوشی، بزدلی نیز عوام کی سرد مہری کی وجہ سے ان کے اقتدار کی باگیں ڈھیلی ہونے لگیں۔ اور سات سمندر پار کی انگریز قوم سے تعلق رکھنے والے ایک تجارتی ادارہ "ایسٹ انڈیا کمپنی" کو یہاں کے امور میں دخل انداز ہونے اور قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ نتیجۃً مغل حکومت بالتدریج ختم اور انگریزوں کا اقتدار مضبوط ہوگیا۔

سب سے پہلے ۱۷۶۵ء میں برطانوی حکومت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی قوانین کے اجراء اور نفاذ کے اختیارات سپرد کئے جس کا مطلب تھا کہ دیوانی مقدمات کے فیصلے اور مال گزاری کی وصولیابی کا حق اس اختیار کے ذریعہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو حاصل ہوگا۔ فوجداری قوانین کے اختیارات اب بھی نوابین اور ان کی عدالتوں کو حاصل تھے۔ البتہ مسلمانوں کے مقدمات کے فیصلے خواہ وہ دیوانی ہوں یا فوجداری اسلامی شریعت کی بنیاد پر ہی ہوتے تھے۔

اسکے چند ہی سال بعد برطانوی پارلیمنٹ نے ریگولیٹنگ ایکٹ ۱۷۷۳ء منظور کیا۔ باوجود اسکے یہ قانون اسلامی اصولوں سے بالکل بے نیاز ہوکر خالص انسانی دماغ کا پیداوار تھا تاہم اس میں بھی پوری صراحت کے ساتھ اسلامی قوانین کے بقاء و تحفظ کا اعلان کیا گیا تھا۔ اور مسلمانوں کو واضح الفاظ میں یقین دہانیاں کرائی گئی تھیں۔ لیکن اس نئے قانون نے عملاً اسلامی قانون کو بے اثر اور محدود کرنا شروع کردیا۔ پھر تقریباً ایک صدی بعد ہی ۱۸۶۰ء میں تعزیرات ہند اور ۱۸۷۲ء میں قانون شہادت برطانوی پارلیمنٹ سے پاس ہوکر ہندوستان میں نافذ ہوا۔ ان قوانین کی روح اور طریقہ نفاذ نے اسلام کے عمومی دیوانی اور فوجداری قوانین کو یکسر منسوخ کرکے رکھ دیا۔ پھر بھی ارباب اقتدار نے برطانوی قوانین اور اسلامی قوانین کے درمیان ایک دائرے میں تال میل پیدا کرنے کی کوشش کی مگر دونوں قوانین کے مزاج میں بعد المشرقین کی وجہ سے عملاً عدالتیں اسلامی قوانین اور مسلم ماہرین قانون (قاضیوں) سے

خالی ہونے لگیں۔

اس عظیم تبدیلی کے باوجود جہاں تک مسلم پرسنل لا کا تعلق ہے وہ کلی طور پر محفوظ رہا۔ کسی ریگولیشن، کسی چارٹر یا پارلیمنٹ کے وضع کردہ کسی قانون کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو بے اثر، محدود یا منسوخ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ مذکورہ بالا سارا انقلاب دیوانی اور فوجداری کے عمومی قوانین تک رہا۔ البتہ مسلم پرسنل لا کے تعلق سے اتنا ضرور ہوا کہ اسلامی قوانین پر حاکمانہ نظر نہ ہونے کی وجہ سے ججوں کی طرف سے اسکی ایسی تعبیریں آنی شروع ہوئیں جو اس کی روح سے ہرگز میل نہیں کھاتی تھیں۔

جب حالت اس درجہ بگڑ گئی تو مسلم عوام اور ان کے قائدین کو اپنی زیاں کاری کا شدید احساس ہوا اور پھر کم از کم مسلم پرسنل لا کو اصل شکل میں نافذ کرانے کے لئے ملک گیر سطح پر ایک تحریک چلائی گئی اور بالآخر شریعت اپلی کیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء منظور کرانے میں کامیاب ہوگئے۔

شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء

اسی شریعت ایکٹ کو مسلم پرسنل لا بھی کہتے ہیں۔ قانون کی کتابوں میں بعض تصرفات کے علاوہ اب بھی مسلم پرسنل لا اپنی اصل صورت میں موجود ہے اسمیں اسلامی قانون کے اصول نہیں بتائے گئے ہیں۔ بلکہ صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ عام مسلمان کن کن حالات و معاملات میں مسلم پرسنل لا کے تابع ہونگے۔ یہ ایکٹ فی الواقع ان موضوعات کی نشاندہی کرتا ہے جن کے تحت اٹھنے والے مسائل کا حل صرف اور صرف مسلم پرسنل لا کی بنیاد پر تلاش کیا جائے گا۔

مسلم پرسنل لا کی ترتیب تدوین میں قرآن و سنت، اجماع قیاس اور اجتہاد کے اصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے عموماً درج ذیل ماخذوں سے رجوع کیا گیا ہے۔ ۱۔ حنفی مسلک کی مشہور کتاب ہدایہ فقہ شافعیہ کی منہاج الطالبین۔ اور وراثت سے متعلق مشہور تصنیف السراجی کے انگریزی تراجم۔ ۲۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں تیار کیا گیا مجموعۂ مسائل جو فتاویٰ عالمگیری کے نام سے مشہور ہے۔ ۳۔ انگریزی میں لکھی ہوئی مستند درسی کتابیں جس میں نواب عبدالرحمٰن، سر عبدالرحیم، سر امیر علی، بیلی، سر ایلڈ ولسن، ڈی ایف ملا، بدرالدین طیب جی، کاشی پرشاد سکسینہ اور اے۔ اے۔ فیضی کی تصنیفات شامل ہیں۔ جدید

قانون کی شکل میں مدون مسلم پرسنل لا کے تحت وہ ایکٹ بھی آتے ہیں جو مختلف مواقع پر خود مسلمانوں کی تحریک پر قرآن وسنت اور مصالح کو سامنے رکھ کر ترتیب دیئے گئے ہیں۔

شریعت ایکٹ کے تحت جو مسائل آتے ہیں وہ تین طرح کے ہیں۔

(الف) پہلی قسم کے قوانین ان امور ومعاملات سے متعلق ہیں جس میں عام مسلمان لازمی طور پر مسلم پرسنل لا کے تابع ہونگے ان معاملات سے متعلق ایسے تمام رسوم ورواج جو شریعت سے متصادم ہونگے وہ ناقابل اعتبار قرار پائیں گے مثلاً:۔۔

وراثت:۔ یعنی کسی متوفی کا ترکہ اسلامی قانون کی رو سے کیسے تقسیم ہوگا اور مختلف اعزہ واقربا کس تناسب سے متروکہ جائیداد کے وارث ہونگے۔

نکاح اسلامی تعلیمات کی رو سے نکاح کا طریقہ۔ اسکے شرائط ولوازمات وغیرہ

تنسیخ نکاح: نکاح کا یہ مضبوط بندھن کن کن مواقع پر کن کن طریقوں سے فسخ ہوگا اسکے تحت طلاق اور اسکا طریقہ اسکی شرعی حیثیت اسکا استحقاق وغیرہ۔ ایلاء اسکی تعریف۔ اسکے مواقع اور دیگر تفصیلات ظہار۔ اسکی تعریف۔ اسکی قانونی حیثیت کفارہ اور مراجعت کا طریقہ وغیرہ۔ لعان اسکی تعریف۔ مواقع استعمال۔ شرعی حیثیت اور طریقہ وغیرہ۔ خلع۔ عورت کن صورتوں میں شوہر سے خلع لے سکتی ہے اور دیگر قانونی تفصیلات وغیرہ۔

نفقہ۔ شوہر پر بیوی کا خرچ کب اور کس انداز ومقدار سے برداشت کرنا واجب ہے نفقہ میں کیا کیا چیزیں آتی ہیں۔ وغیرہ

مہر۔ اسکی تفصیلات۔ موجل، غیر موجل۔ کب واجب ہوتی ہے، کب نصف اور کب کل مقدار کے تعین میں کن چیزوں کی رعایت کی جائیگی وغیرہ احکامات۔

حق شفعہ۔ پڑوسیوں کے باہم دیگر آداب ومراعات، اختلافات اور نزاعات میں فیصلہ کے قوانین وغیرہ۔

ہبہ۔ صاحب جائیداد اپنی ملکیت کو کس طرح دوسرے کو دے سکتا ہے اسکے آداب وشرائط اور دیگر ضروری تفصیلات وغیرہ۔

اوقاف۔ جائدادوں کے وقف کی قسمیں اسکے طریقہ اور موقوفہ جائیداد سے متعلق دیگر

امور ومعاملات۔

ان کے علاوہ حضانت، ولایت نابالغ۔ امانت، جائداد امانت وغیرہ کے مسائل بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

(ب) دوسری قسم ان قوانین کی ہے جسمیں مسلم پرسنل لا کا تعلق اختیاری اور تمیزی ہوگا۔ یعنی کوئی عاقل بالغ مسلمان اگر ان قوانین کو قبول کر لیتا ہے تو اس پر اور اسکی نابالغ اولاد پر اسکا اطلاق ہوگا بصورت دیگر وہ کسی اور قانون کو اختیار کرنے کا مجاز ہوگا۔ اسے اول الذکر کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً وصیت اور تبنیت کے مسائل۔

(ج) مسلم پرسنل لا میں تیسری قسم ان قوانین کی ہے جو ریاستی حکومتوں کے زیر اختیارات ہیں یہ ریاستیں چاہیں تو اسے برقرار رکھیں اور چاہیں تو اسے ختم کر کے دیگر قوانین وضع کریں مثلاً زرعی زمینوں اور باغات وغیرہ کی وراثت۔ یوپی حکومت نے زمینداری ایکٹ ۱۹۵۰ء کے تحت اپنے اختیارات کا استعمال کر کے مسلم عورتوں کو مزروعہ زمینوں کی وراثت سے محروم کر چکی ہے۔

آزادی وطن اور مسلم پرسنل لا پر حملے

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزوں نے اپنی تمام تر عیاریوں اور چالبازیوں کے باوجود کم از کم مسلم پرسنل لا میں مداخلت کرنے اور مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء انہی کے دور اقتدار کا پاس شدہ ہے۔ آزادی وطن سے مسلمانوں کی بے پناہ دلچسپیوں اور اسکے لئے بڑی سے بڑی قربانیوں کے پشت پر دراصل یہ عزائم کار فرما تھے کہ انگریز جس نے ہمارے تمام فوجداری۔ اور دیوانی قوانین کو ختم کر ڈالا ہے صرف شخصی قوانین کی حد تک ہم اس پر "قانوناً" عمل کر سکتے ہیں انہیں دیش سے باہر نکال کر ہم سکھ کا سانس لیں گے اور بھی اپنی عظمت رفتہ اور دیگر قوانین اسلامی کو واپس لا سکیں گے۔

لیکن بصد افسوس ہمارے خونوں کی سرخی لئے ادھر آزادی کا سورج طلوع ہو رہا تھا اور دوسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے تنگ نظر اور متعصب دشمن دیش کی آزادی کے لئے قربان ہونے والے مسلم قائدین کی لاشوں پر بیٹھ کر مسلم ملت کا رہا سہا سرمایہ "مسلم پرسنل لا" لوٹنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

۱۹۵۰ء میں جب دستور ہند سامنے آیا تو نہایت صراحت کے ساتھ دستور ہند کے رہنما اصولوں کی دفعہ ۴۴ کے تحت یہ فقرہ درج تھا۔

"ریاست پورے ہندوستان میں اپنے باشندوں کے لئے یونیفارم سول کوڈ یعنی یکساں شہری ضوابط تشکیل دینے کی جدوجہد کریگی" گرچہ دستور ہند میں بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۵ اور ۲۶ کے ذریعہ اقلیتوں کو ان کے مذہب پر عمل، اشاعت ان کی تہذیب و تمدن، اور ملی تشخص وغیرہ کی ضمانت دی گئی ہے۔ لیکن عملاً ہمیشہ حکمران طبقے اور قوانین کی تشریح و توضیح کرنے والوں نے بنیادی حقوق پر رہنما اصولوں کو فوقیت دی ہے۔ (حالانکہ قانونی نقطۂ نظر سے یہ انداز تعبیر ہی بنیادی طور پر غلط ہے) اور رہنما اصولوں کی دفعہ ۴۴ کی ننگی تلوار سے برابر بنیادی حقوق بالخصوص مسلم پرسنل لا پر حملہ آور ہوتے رہے ہے۔ یوپی سرکار نے تو اول روز ہی زمینداری ایکٹ کے تحت مسلم عورتوں کو مزروعہ آراضی کی وراثت سے محروم کر دیا۔ اسکے چند ہی دنوں بعد ۱۹۵۴ء میں سول میرج ایکٹ کی جگہ اسپیشل میرج ایکٹ پاس کر دیا گیا اسکا مطلب یہ تھا کہ پہلے کوئی مرد یا عورت کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے فرد سے صرف اس صورت میں شادی کر سکتے تھے کہ انھیں پہلے اپنے اپنے مذاہب سے انکار کرنا پڑتا۔ لیکن نئے قانون کی رو سے اپنے مذہب سے انکار ضروری نہیں ہے۔ ایک عورت اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے بھی کسی ہندو، سکھ، عیسائی یا برہمن سے شادی کر سکتی ہے۔ یہ شادی نہ صرف قانوناً جائز قرار پائے گی بلکہ جو اولاد پیدا ہوگی وہ جائز ہوگی اور وراثت کی حقدار ہوگی۔ اس مداخلت سے اسلام کا یہ اصول کالعدم ہو جاتا ہے کہ کوئی مسلمان عورت کسی غیر مسلم مرد سے شادی نہیں کر سکتی اور اگر وہ ایسا کرتی ہے تو مسلم معاشرے میں شامل نہیں رہ سکتی۔ اس طرح حکومت نے ایک حکمنامے کے ذریعہ سرکاری ملازمین پر تعدد ازدواج کے سلسلے میں جو پابندی عائد کی ہے اس سے مسلم ملازمین اپنے اس حق سے محروم ہو گئے ہیں جس کی گنجائش شریعت نے تسلیم کی ہے۔

آزادی کے بعد سے اب تک ذمہ داران حکومت نے شاطر راہ زن کی طرح مختلف مواقع پر نہایت گھٹیا اور غیر قانونی طریقے اختیار کر کے مسلم پرسنل لا کو مجروح اور متاثر کرنے کی برابر کوشش کرتے رہے ہیں۔ متبنیٰ بل ۱۹۷۲ء سب کے علم میں ہے۔ اس کو

پیش کرتے وقت باقاعدہ صراحت کی گئی کہ یہ یکساں سول کوڈ کی طرف اہم اقدام ہوگا۔ گویا ہندو کوڈ کے مطابق تمام شخصی قوانین کو ڈھال کر یونیفارم سول کوڈ کی منزل مقصود تک تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ بل پاس نہ کرایا جا سکا۔ حق شفعہ جو مسلم پرسنل لا کا ایک اہم باب ہے سپریم کورٹ نے اسکے خلاف فیصلے کر کے غلط نظیریں قائم کیں۔ اور عملاً اس کا بیشتر حصہ کالعدم ہو گیا۔

محمد احمد خاں بنام شاہ بانو کیس کا حالیہ فیصلہ جو ۲۳ اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ نے دیا اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

محمد احمد بنام شاہ بانو کیس

مقدمہ زیر تعارف کے اصل فریقین محمد احمد (اپیل کنندہ) اور شاہ بانو (مدعی علیہا) کی شادی ۱۹۳۲ء میں ہوئی تھی۔ محمد احمد خاں پیشہ کے اعتبار سے وکیل ہیں۔ دونوں کی ازدواجی زندگی ۴۳ سال کے عرصے تک برقرار رہی جس کے دوران پانچ بچے پیدا ہوئے ۱۹۷۵ء میں شوہر نے کسی بات پر بیوی کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ اپریل ۱۹۷۸ء میں شاہ بانو بیگم نے محمد احمد خاں کے خلاف اندور کے جوڈیشیل مجسٹریٹ کی عدالت میں ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت عذرداری داخل کی جس میں شوہر محمد احمد خاں، سے پانچسو روپے ماہانہ کے حساب سے نان نفقہ دلانے کی درخواست کی گئی تھی۔ ۶ نومبر ۱۹۷۸ء کو اپیل کنندہ (محمد احمد) نے مدعی علیہا (شاہ بانو بیگم) کو طلاق مغلظ دے دی مدعی علیہا کی نفقہ کی درخواست کے جواب میں محمد احمد خاں کی یہ دلیل تھی کہ اس کی طرف سے طلاق دے دیئے جانے کے بعد مدعی علیہا کو بیوی کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اور اس بنا پر اس پر کسی بھی بنیاد پر نان نفقہ ادا کرنے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ وہ تقریباً دو سال تک دو سو روپے ماہانہ کے حساب سے نفقہ ادا کر چکا ہے اور عدت کے دوران ہی وہ مہر کی تین ہزار روپے کی رقم عدالت میں جمع کرا چکا ہے۔

اگست ۱۹۷۹ء میں جوڈیشیل مجسٹریٹ نے شاہ بانو بیگم کے دعوے پر فیصلہ دیتے ہوئے محمد احمد خاں کو نفقہ کے طور پر ۲۵ روپے ماہانہ اول الذکر کو ادا کرنے کی ہدایت کی۔ مجسٹریٹ کے اس فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست محمد احمد خاں کی جانب سے مدعیہ پر دلش ہائی کورٹ میں

داخل کی گئی۔ مدھیہ پردیش ہائی کورٹ نے جوڈیشیل مجسٹریٹ کے فیصلے کو صرف برقرار رکھا بلکہ طلاق نفقہ ادا کی جانے والی رقم ۲۵ روپئے سے بڑھا کر ۱۷۹ روپئے نو پیسے مقرر کی۔ ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف محمد احمد خاں نے سپریم کورٹ میں خصوصی اپیل دائر کی۔ یہ اپیل پہلے دو نفری بنچ کے سامنے پیش ہوئی لیکن جسٹس مرتضیٰ فضل علی مرحوم اور جسٹس دے وارادا راجن پر مشتمل اس بنچ نے اس اپیل کو دور رس نتائج کے حامل سوالات پر مشتمل قرار دیتے ہوئے نیز مسئلہ زیر بحث سے متعلق سپریم کورٹ کے دو سابق فیصلوں پر نظر ثانی کی ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ایک آرڈر مجریہ ۳ فروری ۱۹۸۱ء کے ذریعہ یہ اپیل ایک وسیع تر آئینی بنچ کے سپرد کر دی تھی۔ اس وقت کے چیف جسٹس مسٹر چندر چوڑ کی سربراہی میں پانچ نفری آئینی بنچ نے اس خصوصی اپیل پر طویل سماعت کے بعد مدھیہ پردیش ہائی کورٹ کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے اپیل خارج کر دی۔ نیز اس فیصلہ کو برقرار رکھا کہ مطلقہ مسلم بیوی کو عدت کی مدت گزر جانے کے بعد بھی نان نفقہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔ (دعوت)

اس فیصلے کے بعض مضر اور خطرناک پہلو

زیر بحث فیصلہ کا پیراگراف قابل توجہ ہے بہت بڑی تعداد میں درمیانہ عمر کی عورتوں کو بلا سبب طلاق دیا جاتا ہے انہیں اس حال میں سڑک پر نہیں پھینک دیا جانا چاہیے کہ نہ تو ان کے سروں پر چھت ہو اور نہ ہی ان کے اور ان کے بچوں کے گزر بسر کا کوئی ذریعہ ہو۔ "سیدھے سادھے لوگ سپریم کورٹ کے ان مگرمچھ کے آنسوؤں سے متاثر ہو جاتے ہیں جو اس نے مسلم عورتوں کی مظلومیت اور ان کی کسمپرسی پر بہائے ہیں۔ یہاں یہ بحث غیر ضروری ہے کہ مذہب اسلام نے عورتوں کو تحفظ دیئے ہیں یا کسی اور نے نیز واقعات کی روشنی میں مسلم عورتیں زیادہ باوقار زندگی گزار رہی ہیں یا کوئی اور یہاں اختصار کے ساتھ یہ بتانا پیش نظر ہے کہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے اسلامی قوانین اور مسلم معاشرہ پر کہاں کہاں ضرب پڑ رہی ہے۔

۱۔ فیصلہ میں سپریم کورٹ نے سورہ بقرہ کی آیات ۲۴۱، ۲۴۲ میں متاع کی اپنے طور پر ایسی تعبیر و تشریح کی ہے جس کی جدید و قدیم کسی مفسر کی تفسیر میں کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ اگر ہندوستان کی عدلیہ کے اس حق کو مسلمان تسلیم کر لیتے ہیں تو اس کا واضح مطلب یہ قرار پائے گا کہ عدالتیں

جب چاہیں قرآن کے جس حکم کی من مانی اور حسب منشا مطلب تشریح کر سکتی ہیں اور اسے مسلم معاشرے کو تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتی ہیں۔ یہ ایک ایسا زبردست حادثہ ہوگا جس سے اسلام کے تمام احکامات کی چولیں ہل جائیں گی۔ اور مسلم پرسنل لا عدالتوں کے ہاتھوں بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ پھر یونیفارم سول کوڈ یا بالفاظ دیگر ہندو کوڈ کے نفاذ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی۔

۲۔ فیصلہ کا دوسرا خطرناک پہلو سپریم کورٹ کا حکومت ہند سے یہ سفارش کرنا ہے کہ "وہ جرأت سے کام لیکر دفعہ ۴۴ کے بموجب تمام شہریوں پر یونیفارم سول کوڈ نافذ کرے"۔ اور یہ کہنا کہ "عدالتوں کو ناگزیر طور پر سماجی مصلح کا رول ادا کرنا پڑے گا"۔ یہ دونوں جملے حکومت ہند اور اس کی عدلیہ کے ان ناپاک عزائم کی واضح طور پر نشاندہی کرتے ہیں جن کے تحت مذکورہ بالا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۳۔ بحمداللہ مسلم معاشرہ اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود بہت حد تک جنسی آوارگی اور جنسی بے راہ روی سے پاک ہے۔ فیصلہ زیر بحث کے ذریعہ ایک مطلقہ عورت نان نفقہ کی ضمانت پا لینے اور جائز جنسی تعلق سے محروم ہونے کے بعد قوی امکانات اس بات کے پائے جاتے ہیں کہ وہ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ بدکاری میں ملوث ہو جائے۔ سابق شوہر سے نفقہ وصول کرے اور اس کی آنکھوں کے سامنے بھانت بھانت کے مردوں سے یارانہ کرتی پھرے۔ واضح رہے اکثر طلاق کی وجہ عورت کی بے راہ روی بھی ہوتی ہے غرضیکہ کسی قسم کا مادی یا معاشرتی خوف اب ان کی بے راہ روی میں حارج نہ ہو سکیگا۔

۴۔ طلاق کو اسلام نے ابغض المباحات قرار دیا ہے۔ لیکن بہر حال ہر متمدن قانون میں اس کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ بہت سے ظاہری اور باطنی وجوہات ایسے ہوتے ہیں جس سے طلاق ضروری امر قرار پا جاتا ہے۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے سے جب شوہر یہ سمجھیں گے کہ طلاق دینے کے بعد عدالت سے طے شدہ رقم اسے اپنی مطلقہ کو تاحیات یا تا نکاح ثانی دینا پڑے گا تو ایسی صورت میں طلاق کے ضرورت مند حضرات کے سامنے دو راستے وضاحت کے ساتھ آئیں گے۔

ایک یہ کہ وہ عورت کو طلاق نہ دیکر اسے گھر ہی میں ملازمہ سے بدتر زندگی گذارنے پر مجبور کر دیں۔ دوسرا اپنی ضرورت کے لئے دوسری شادی کر ڈالیں۔ ایسی صورت میں اسلام کی شرط عدل بھی متاثر

ہوگی۔ دوسری صورت یہ ہوگی کہ نکاحِ ثانی کے لئے پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بجائے مختلف حیلوں سے قتل کر دیا جائے۔ جب کہ دوسری قوموں میں بہت بھیانک انداز سے یہ ہو رہا ہے۔ پھر سوچئے مسلم معاشرہ کا کیا حشر ہوگا۔ تعجب تو یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی عورتوں کی مظلومیت نظر نہیں آتی دراصل جو لوگ اس بربریت سے محفوظ ہیں انہیں زبردستی قانون کا سہارا لیکر اس ڈگر پر ڈال دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

۵۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارے ایمان اور دینی تشخص کا کیا حشر بنے گا۔ اگر حکومت کے ان نازیبا اقدامات پر بند نہ لگائی گئی۔ ممکن ہے ہماری محدود عقل کی میزان پر قرآن و حدیث کا کوئی قانون نہ اترے تو یہ شریعت کا قصور نہیں ہے اپنی کوتاہ فکری پر ماتم کرنا چاہئے۔

پھر عورتوں کی عزتِ نفس، خودداری کے پہلو سے اس فیصلہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس فیصلے کے طریقِ نفاذ کی عملی شکلوں پر غور کیا جا سکتا ہے کہ اس فیصلے سے کس انداز کی معاشرتی اور اخلاقی پیچیدگیاں پیدا ہونگی۔

سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ اسلام کے راہِ اعتدال سے کسی بھی معاملہ میں ہٹنے پر ایسی ایسی الجھنیں اور پیچیدگیاں ہونگی جس کا عام انسانی ذہن استقصاء نہیں کر سکتا۔ اوپر چند نہایت واضح اور عام فہم باتیں درج کی گئی ہیں۔

بقیہ جہاد افغانستان

کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ حزبِ اسلامی کے سر پر اس فتح کا تاج سجے اور وہ تمام اسلحہ اور مالِ غنیمت پر قبضہ کرے۔ چنانچہ اس موقع پر ان کی طرف سے قبائلی اور علاقائی تعصبات کو اٹھانے کی کوششیں کی گئیں جو کہ ایک لاحاصل عمل تھا۔ اور خدا کے فضل سے اس کا کوئی اثر مجاہدین پر نہیں ہوا۔

باقی آئندہ

> دنیا میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔
> (سورۂ آل عمران)

غزل

برادرم فارقلیط صاحب سلام رحمت

آپ کا مرسلہ لفافہ ملا۔ دہلی سے آپ کی روانگی کے اگلے ہی دن میں نے ترانہ آپ کے صدر محترم جناب نسیم غازی صاحب کے حوالہ کر دیا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ وہ ابھی تک منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا۔ فرمائش کے مطابق تازہ ترین اور غیر مطبوعہ غزل ارسال کر رہا ہوں۔ جملہ احباب کی خدمت میں سلام مسنون عرض کیجئے۔

ہم غم بھول گئے، داغِ الم بھول گئے
تجھ کو ہم پا کے زمانے کے ستم بھول گئے

دامِ خوش رنگ میں پھر آ گئے مرغانِ چمن
حیف! پھر فطرتِ اربابِ کرم بھول گئے

مجھ کو پیمانِ وفا یاد دلانے والے
اپنا پیمانِ وفا اپنی قسم بھول گئے

کہہ گئے اُن سے نہ کہنے کی تو باتیں کیا کیا
اک وہی بات جو کہنے کی تھی ہم بھول گئے

رکھنے والوں نے بھرم عصمتِ غم کا رکھا
بھولنے والے ترے لطف و کرم بھول گئے

گھر سے بے گھر ہوئے بیگانۂ منزل ٹھہرے
وہ مسافر جو ترے نقشِ قدم بھول گئے

ہیں تو وہ آج بھی تیرے ہی پرستار مگر
تیری باتیں تیری خوشیاں تیرے غم بھول گئے

معتبر جتنے حوالے تھے کہانی کے عزیزؔ
لکھنے بیٹھے تو وہی اہلِ قلم بھول گئے

عزیز بگھروی
۲۸ جنوری ۱۹۸۲ء
۲۵۰۳، بارہ دری شیر افگن، بلیماران
دہلی - ۱۱۰۰۰۶

اجودھیا کی بابری مسجد

تاریخی حقائق کی روشنی میں

وشو ہندو پریشد (ہندو کی عالمی تنظیم) نے ۷، ۸ر اپریل ۱۹۸۴ء کو ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا جس میں ملک بھر کے ہندو انتہا پسند شریک ہوئے اسے دھرم سنسد (مذہبی پارلیمنٹ) کا نام دیا گیا۔ اس میں ایک خطرناک منصوبہ تیار کیا گیا کہ ایسی تحریک شروع کی جائے جس سے عام ہندو کا اعتماد حاصل ہو جائے اور انھیں متحد کیا جا سکے اور مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا جا سکے کہ وہ اسلام کو ترک کر دیں۔ اپنے آباء و اجداد کے مذہب ہندو میں آجائیں۔ آبادیوں سے باہر مقامات میں آباد ہوں۔ ان کے لئے معیشت کے دروازے بند ہو جائیں، ان کا تہذیبی وجود ختم کر دیا جائے اور تاریخ کو اس طرح مسخ کر کے پیش کیا جائے کہ مسلمان نام کی کوئی جماعت اس ملک میں باقی نہ رہے۔

مذکورہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے وشو ہندو پریشد نے بنارس کی گیان باپی مسجد، متھرا کی عیدگاہ اور اجودھیا کی بابری مسجد کو آزاد کرانے کے اول الذکر کو وشوناتھ کا مندر اور ثانی الذکر کو کرشن جنم بھومی اور ثالث الذکر کو رام جنم بھومی میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا اسکے اس مطالبہ کی حمایت ہندوستان میں طول و عرض میں پھیلی ہوئی صحافت چاہے وہ انگریزی کی ہو یا ہندی کی، سب نے کی۔ انھوں نے اپنے اداریوں اور تبصروں میں ایسے مضامین شائع کئے جن میں یہ مطالبے شامل تھے کہ ان مسجدوں کو ہندوؤں کے حوالہ کر دیا جائے اور اس کے ذریعہ ہندو عوام میں یہ خطرناک رجحان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ مشتعل ہو کر مسجد کو مندر سمجھیں جو حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔

وشو ہندو پریشد نے اپنی تحریک میں اکثریتی فرقہ کے خاص و عام کو شامل کرنے کے لئے ۲۵ر ستمبر کو سیتا مڑھی بہار سے رام جانکی رتھ یاترا کا انتظام کیا۔ ۲۵ ہزار ہندوؤں نے سرجو ندی کا پانی ہاتھ میں لے کر رام جنم بھومی مکتی (آزاد) کرانے کے نام پر بابری مسجد پر مکمل قبضہ کرنے کی قسم کھائی، اس سنکلپ سماروہ (اجتماعی عہد کی تقریب) میں بڑے بڑے ہندو سنت، مہا سنت اور اکثریتی طبقہ کے سیاسی لیڈروں اور ان کے نمائندوں کے علاوہ بیکوڈ ٹی کے ذمہ داروں نے شرکت کی۔ یہ رتھ یاترا ۱۰ر اکتوبر کو اجودھیا پہونچی، فیض آباد، سوہاول، بارہ بنکی ہوتے ہوئے ۱۴ر اکتوبر کو لکھنؤ پہنچی اور بیگم حضرت محل پارک میں جلسۂ عام کیا اور بابری مسجد کو ہندوؤں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

تین گنبدوں والی بابری مسجد ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک مسلمانوں کی عبادت گاہ تھی لیکن ۲۲، ۲۳ دسمبر کی درمیانی شب میں فیض آباد کے ضلع مجسٹریٹ کی جانب داری اور اشارہ پر ہنومان گڑھی کے مہنت ابھے رام داس نے اپنے چیلوں کے ساتھ مسجد میں گھس کر مسجد کے اندر درمیانی گنبد میں مورتیاں رکھ دیں۔ جب صبح مسلمانوں کو اس غیر قانونی اور شرارت آمیز واقعہ کا علم ہوا تو مورتیوں کو گنبد سے ہٹانے کا مطالبہ کیا ضلع مجسٹریٹ کے کے نائر جو کہ اس سازش میں پہلے سے شامل تھے کے اشارہ پر مسجد کے پھاٹک پر تالا لگا کر بند کر دیا گیا اور پولیس کا پہرہ بٹھا دیا گیا یہاں تک کہ مسلمانوں پر مسجد کے چاروں طرف ۲۰۰ گز کی دوری میں داخل ہونے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اور یہ پابندی آج تک عائد ہے۔

مسجد میں بدستور مورتیاں رکھی ہیں اور پجاری پوجا پاٹ کر سکتے ہیں، عام ہندوؤں کو بھی مسجد کے پھاٹک تک جا کر درشن کرنے اور چڑھاوا پیش کرنے کی اجازت ہے۔ پھاٹک پر گذشتہ ۳۶ سال سے اکھنڈ کیرتن ہو رہا ہے کوئی مسلمان اس کے نزدیک نہیں جا سکتا اور انتظامیہ نے یکطرفہ طور پر عملاً اس مسجد کو اکثریتی طبقہ کے حوالہ کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے اس مطالبہ کو کہ انتظامیہ اسے انتہا پسندوں سے خالی کرا کے مسلمانوں کے حوالہ کرے، اس میں ناکام ہی رہی بلکہ اس کا کردار بھی افسوسناک اور مسلمانوں کے لئے باعث تکلیف رہا ہے۔

مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ بابری مسجد سے مورتی ہٹائی جائے، مسجد کے احاطہ میں جو نیولے

الٹنے کی رٹ اور پوجا پاٹھ پر پابندی عائد کی جائے اور موجودہ ریسیور دراکو فوری طور پر برطرف کیا جائے، نماز پر سے پابندی اٹھالی جائے اور مسجد کو مسلمانوں کو واپس کیا جائے اور اکثریتی طبقے کے مذہبی وسیاسی انتہا پسندوں نے مسلم تاریخ کے تابناک دور اور حکمرانوں کے خلاف دشنام طرازی اور ناقابل یقین قصے اور واقعات جو منسوب کئے ہیں اور تاریخ کے غلط حوالے دے کر گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے اور ہندوستان کے معماروں کو ذلیل کرنے کے لئے جو سازش کی ہے اس کے خلاف سخت اقدام کئے جائیں اور انتظامیہ کی جانب سے جو کھل کر جانبداری کی گئی ہے اس سے اقلیتوں میں عدم تحفظ کا احساس ہوتا ہے یہ انتظامیہ کی ذمہ داری ہے کہ ملک کے سیکولر کردار کے تحفظ کے لئے ملک کو درپیش خطرات کا سدباب کرے اور حقدار کو حق واپس دلائے۔

مذکورہ بالا الزام تراشیوں اور گمراہ کن پروپیگنڈوں کا سدباب کرنے کے لئے انجمن تحفظ مساجد نے بابری مسجد کے حقائق کو پیش کیا ہے جس سے یہ انکشاف ہو گیا ہے کہ اکثریتی طبقے کے انتہا پسند اشخاص کتنی سطحیت تک جانے کے لئے تیار ہیں اور اصل حقیقت سے واقفیت ایک محب وطن کے لئے کتنا ضروری ہے۔

معلومات ماخوذ از کتابچہ ''ہندی'' اور ''بابری مسجد'' اور ''بازار لکھنؤ''۔

مسلمانوں اور مسلمان حکمرانوں کے خلاف نفرت سے معمور فضا میں لوگوں کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ تاریخی شہادت کی روشنی میں اجودھیا کی مسجد اور رام جنم بھومی کے نام سے اس کی بازیابی کی مہم کے بارے میں ٹھنڈے دل سے غور کر سکیں۔ پروپیگنڈہ کی زور دار مہم کے دوران جسے وشو ہندو پریشد اور اس کی ہم نوا جماعتوں نے چلا رکھا ہے حق و انصاف کی آواز سننا لوگوں کے لئے مشکل ہو گا لیکن ہم اصل حقیقت کا انکشاف اس امید کے ساتھ کر رہے ہیں کہ وہ لوگ جو حق پسند اور منصف مزاج ہیں اصل حقیقت سے آشنا ہو سکیں اور مذہب کے نام پر نفرت اور ایذا رسانی کی اس مہم کو بند کرا سکیں جو ہندوستان کی یکجہتی کے بھی خلاف ہے۔

اترپردیش کے ایک سابق وزیر اور کانگریسی لیڈر جناب داؤ دیال کھنہ جو مراد آباد کے فسادات میں کافی نام کما چکے ہیں اس بازیابی مہم کے لیڈر ہیں ان کے دستخط سے ''رام جنم بھومی اجودھیا کرشن جنم بھومی متھرا اور کاشی وشوناتھ مندر بنارس ہندوؤں کو واپس کئے جائیں'' کی سرخی

کے ساتھ ایک پمفلٹ جاری کیا گیا۔ اس پمفلٹ میں اجودھیا کی مسجد کے بارے میں جو دعویٰ کیا گیا وہ سو فیصد غلط اور بے بنیاد ہے اور اس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی ایذا رسانی اور ان کے مقدس مقامات کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اس مسلم دشمن مہم کا مقصد کیا ہے؟ کھنہ صاحب نے چند دنوں قبل لکھنؤ میں ایک پریس کانفرنس میں اس کی وضاحت کی تھی۔ اس وضاحت سے یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس کا مقصد ہندوستان کے اس سیکولر کردار کو تباہ کرنا ہے جسے اس ملک کے اولین قائدین نے ملک کی آزادی کے وقت تجویز کیا تھا۔ جناب کھنہ صاحب نے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے اور صاف الفاظ میں کہا ہے کہ اگر مسلمان اس غیر منصفانہ عہد اور اخلاقی دباؤ کے سامنے جھک کر اپنی مسجدیں اور مقدس مقامات ان کے حوالے کرنے کو تیار نہیں ہیں تو وہ اس ملک میں سیکولرزم کو تباہ کر دیں گے اس کی جگہ مذہبی حکومت قائم کریں گے۔ ان کے اپنے الفاظ میں ''مسلمان ہمارا کام روک نہیں پاسکتے۔ یعنی اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ سیکولرزم اس ملک میں قائم رہے تو انھیں فرقہ پرستوں کو اجازت دینی ہوگی کہ وہ ان کی مساجد اور مقدس مقامات کو برباد کر سکیں۔''

یہ دھمکی صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں ہے دراصل اس کے مخالف وہ سبھی لوگ ہیں جو سیکولرزم کے حامی اور مذہبی رواداری کے علمبردار ہیں ان سبھی لوگوں کو ہوشیار رہنا چاہئے کیونکہ ان کی خاموشی کی وجہ سے ہی مذہبی کٹرپن نے ہندوستان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

جناب کھنہ صاحب نے اپنے دعویٰ کی بنیاد جھوٹ، مکر اور فریب پر رکھی ہے۔ اس کی ایک بنیاد عالمگیر نامہ کا اقتباس ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ''چار سال خاموشی کے بعد شاہی افواج نے اجودھیا میں رام جنم بھومی پر اچانک حملہ کیا اور ۲۳ محرم ۱۶۶۴ء کو دس ہزار ہندوؤں کو قتل کر کے مندر کو منہدم کر دیا''۔ یہ اقتباس جعل سازی کا شاہکار ہے۔ انھوں نے تاریخ اور مہینہ تو ہجری سن کا دیا مگر سن عیسوی ہے۔ ہجری سن کے اعتبار سے شہنشاہ اورنگ زیب نے ہندوستان پر ۱۰۶۸ھ سے ۱۱۱۸ھ تک حکومت کی تھی۔ عالمگیر نامہ میں تمام تاریخیں ہجری سن کے ساتھ دی گئی ہیں۔ عالمگیر نامہ میں عیسوی سن دینے کا سوال ہی نہیں اٹھتا کیونکہ اس وقت ہندوستان میں انگریزی سن مروج نہیں تھا۔ اگر ۱۶۶۴ء کو ہی ہجری سن مان لیں تو شہنشاہ اورنگ زیب

کر تخت نشین ہو کر مندر کو منہدم کرنے کے لئے ابھی ۲۰۰ سال اور انتظار کرنا پڑے گا۔

اس کی یہ غلطی جناب کھنہ صاحب کی جعل سازی کو اور واضح کر دیتی ہے کیونکہ عالمگیر نامہ کی عبارت کو ایجاد کرنے میں ان سے اور بھی غلطیاں ہوئی ہیں، اگر اس سن کو عیسوی مان لیا جائے تو یہ غلطی اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اورنگ زیب ۱۶۹۳ء سے لے کر ۱۷۰۷ء تک دکن میں اپنی فوجوں کی کمان کر رہا تھا اور شمال کے پر امن ماحول میں شاید ہی اس کی فوج کا کوئی حصہ باقی بچا ہو۔

مندرجہ بالا باتوں سے قطع نظر عالمگیر نامہ میں حقیقتاً اجودھیا پر افواج شاہی کے حملے کرنے کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ مذکورہ اقتباس محض اختراع اور جعل ہے جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نفرت پیدا کرنا ہے۔

اس جعل سازی کی ایک دوسری مثال آئین اکبری کا ایک حوالہ ہے، حالانکہ آئین اکبری تاریخی حالات کے بجائے عہد اکبری کی ان تفاصیل کا مجموعہ ہے جو آج کل گزیٹیر میں ہوتی ہیں۔ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اجودھیا کے ہندوؤں نے بیس بار حکومت کے خلاف مسلح جد و جہد کی اور شاہی فوجیں ان کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئیں۔ جعل و فریب کو کس طرح تاریخی کتابوں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ بظاہر جناب کھنہ صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں کی نظر میں ہر چیز جس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نفرت کا بیج بویا جا سکے، جائز ہے۔

جناب کھنہ صاحب صرف ہندوستانی مسلمانوں سے نفرت نہیں کرتے بلکہ پورا عالم اسلام ان کی نظر میں نفرت انگیز ہے۔ پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "آپ کو ان اسلامی ممالک میں ایک بھی سیکولر ملک نہیں ملے گا۔" جناب کھنہ صاحب کی معلومات بہت محدود ہیں۔ انہیں یہ نہیں معلوم کہ انڈونیشیا، ملیشیا، شام اور لبنان، ترکی اور عراق، متحدہ عرب امارات سیکولر ریاستیں ہیں اور ان کے علاوہ بہت سے مسلم ممالک ہیں۔ مثلاً ایشیا میں ترکستان جہاں سے بابر آیا تھا، ترکستان وغیرہ اور یورپ میں البانیہ نہ صرف سیکولر بلکہ کمیونسٹ بھی ہیں۔ بدیہی طور پر جناب کھنہ صاحب کی نفرت ہندوستانی مسلمانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے دائرہ

میں دنیا بھر کے تمام مسلم ممالک آ جاتے ہیں۔ ان کا مقصد ہندوستانی عوام کو عالم اسلام سے الگ کرنا ہے، جو ہندوستان کا پڑوسی ہے۔ یہ کام وہ ایسے وقت انجام دے رہے ہیں جبکہ یہ پورا خطہ عظیم طاقتوں کی آپسی چپقلش کی وجہ سے ایک ہیجانی دور سے گزر رہا ہے۔ نفرت کی اس مہم کو چلانے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں ایسے اشتہار تقسیم کئے گئے ہیں جن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ رام جنم بھومی کو سب سے پہلے بابر نے منہدم کیا جس نے اس کی جگہ پر مسجد تعمیر کی۔

یہ دعویٰ بھی سراسر غلط ہے۔ بابر کبھی اجودھیا گیا ہی نہیں اور اس لئے اس کے مندر منہدم کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ بابر نے ہندوستان میں اپنی جنگی کارروائیوں کو تزک بابری میں تفصیل سے بیان کیا ہے جو ترکی ادب کا ایک شاہکار ہے۔ اس کتاب میں بابر کے اجودھیا پر حملہ کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ مورخ اے۔ ایس۔ بیوورج جس نے تزک بابری کا انگریزی ترجمہ کیا ہے اور مفصل نوٹ بھی دیئے ہیں، اس نے "میموارس آف بابر" کی جلد دوم میں (لندن ۱۹۲۲ء صفحہ ۶۸۰-۶۷۹) ایک حاکم شیخ بایزید کی بغاوت کے سلسلے میں بابر کے اودھ سے گزرنے کا ذکر کیا ہے۔ اس نے واضح طور پر لکھا ہے کہ بابر گھاگھرا کو پار کر کے مشرق کی سمت سے اودھ میں داخل ہوا لیکن یہ مقام اجودھیا سے بہت دور ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ بروز دوشنبہ ۲۲ رمضان ہم جو پادہ میں داخل ہوئے جہاں کے راستے دریائے سرجو کے کنارے ہوتے ہوئے بہار اور سروا کے قصبوں سے فارغ ہو کر اور دس کوس (بیس میل) چلنے کے بعد دریائے سرجو کے کنارے کیلیرہ نامی گاؤں میں جو نچھور کے علاقے میں ہے قیام کیا۔ ہم نے کئی دن اس مقام پر گزارے، یہاں آب رواں ہے، اچھی عمارتیں ہیں، اشجار خاص طور پر آم کے درخت، اور رنگ برنگ کی چڑیاں ہیں۔ ہم نے غازی پور کیلیرہ کوچ کرنے کا حکم دیا۔

بابر کی مسرت کی وجہ یہ تھی کہ چند روز قبل اس کی فوج نے شیخ بایزید کی بغاوت کو کچل دیا تھا، اس کے لئے اس نے جنید محمود سلطان اور قراچہ کا تقرر کیا تھا۔ بیورج نے سوانح میں لکھا ہے: "بروز ہفتہ سات رجب کو ہم نے اودھ سے روانگی کوس (چھ میل) پر گھاگھرا اور سروا کے سنگم سے پہلے قیام کیا (سنگم بہرائچ میں ہے)۔ اس وقت تک شیخ بایزید سروا کے دوسری جانب ہوگا، اور اودھ سے دوسری سمت، اور سلطان (جنید محمود سلطان) سے خط و کتابت کر رہا ہوگا۔

اس کی دھوکہ بازی سے واقفیت کی بنا پر بابر نے بوقت ظہر قباچہ کو حکم دیا کہ وہ دریا پار کرنے کیلئے تیار ہو جائے۔ قباچہ کے پہنچنے پر انھوں نے فوراً دریا پار کیا وہاں پچاس گھوڑ سوار اور تین یا چار ہاتھی موجود تھے۔ وہ مقابلے کی تاب نہ لاسکے اور راہ فرار اختیار کی چند لوگ جو گھوڑوں سے اتر پڑے تھے ان کے سر کاٹ کر حاضر کئے گئے۔"

حالانکہ بابر کی اجودھیا میں داخلے کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے لیکن حکومت اتر پردیش نے ۱۹۶۰ء میں ضلع فیض آباد کا جو گزٹ شائع کیا ہے اس میں واقعات کو اس طرح توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے کہ بابر اجودھیا گیا اور وہاں اس نے کئی دن قیام کیا۔

شیخ بایزید کی شکست کے بعد بابر نے باقی بیگ تاشقندی کو اودھ کا حاکم مقرر کیا اور اپنی فوجوں کے ساتھ کوچ کر گیا۔

میر باقی نے اپنے آقا کی یادگار کے طور پر ۱۵۲۸ء میں اجودھیا میں مسجد تعمیر کی اس مسجد میں جو سنگی تختی لگی ہوئی ہے اس میں صاف طور سے لکھا ہے کہ مسجد کی تعمیر شیخ باقی نے کرائی تھی۔ تختی پر کندہ عبارت یہ تھی۔

"بحکم شہنشاہ بابر جس کا انصاف چرخ گردوں تک دیتی ہے۔ نیک دل میر باقی نے فرشتوں کے اس آشیاں کو تعمیر کرایا۔ خیر یہ ہمیشہ باقی رہے اور اس کی تاریخ "بود خیر باقی" یعنی ۹۳۵ھ"

پمفلٹ میں کیا گیا یہ دعویٰ کہ بابر نے مندر منہدم کرایا کس قدر بے بنیاد ہے؟ اگر بابر نے اجودھیا میں مسجد بنوائی ہوتی تو کس کی ہمت تھی کہ اس کے یا اس کے جانشینوں کے دور میں اسے شہید کرتا اور بار بار مندر بنواتا جسے بار بار منہدم کرنے اور مسجد کی تعمیر کے لئے اورنگ زیب کو فوج کشی کرنی پڑتی۔

ظاہر ہے کہ نہ تو بابر نے اور نہ اورنگ زیب نے اجودھیا میں کسی مندر کو منہدم کرایا اور نہ اس کی جگہ مسجد تعمیر کرائی لیکن موجودہ مہم کو چلانے کے لئے تاریخی حقائق اور انصاف کو نظر انداز کر کے کہانیاں گڑھ لی گئی ہیں۔ اس بے بنیاد اختراع کے لئے یہ قصہ بھی گڑھا گیا ہے کہ چھتریوں نے بغاوت کی جن کی سرکوبی کے لئے مغل فوجیں بھیجی گئیں۔ اس جھوٹ کے حوالے کے لئے آئین اکبری اور عالمگیرنامہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔

اورنگ زیب پر لگائے گئے الزامات کی تصدیق مشہور مؤرخ جادوناتھ سرکار کی تحریروں سے بھی نہیں ہوتی حالانکہ اس نے اورنگ زیب پر سخت تنقید کی ہے مگر اجودھیا پر اسکی فوج کشی یا مندر منہدم کرنے اور مسجد کی تعمیر کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

جناب کھنہ صاحب کے الزامات کا آخری بند یہ ہے کہ بھگوان کی موجودہ جنم بھومی پر حکومت نے ۱۹۴۹ء میں قفل ڈال دیا تھا اور آج بھی پڑا ہوا ہے۔ انھوں نے جان بوجھ کر یہ حقیقت چھپائی ہے کہ یہ عمارت مندر نہیں مسجد ہے۔ جس پر مسلم دشمن بلوائیوں نے ۲۲-۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں پولیس کی موجودگی میں داخل ہو کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور دوسرے ضلع حکام کی درپردہ اعانت سے مورتی نصب کر دی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر نیر کو اس شرمناک کارنامے کی بنا پر بالآخر استعفےٰ دینا پڑا۔ مذکورہ پمفلٹ میں اودھ کی گنشتری لکھنؤ کے گزیٹیر کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ ۱۸۸۰ء میں مطبوعہ گزیٹیر رام جنم بھومی کے مندر کے انہدام کا کوئی ذکر نہیں ہے البتہ ۱۹۰۵ء میں مطبوعہ گزیٹیر میں کہا گیا ہے کہ "یہ وسیع ٹیلہ جسے رام کوٹ کہا جاتا ہے اس میں وہ مقام بھی ہے جہاں رام چندر جی پیدا ہوئے تھے اس کے بہت بڑے حصہ کو وہ مسجد احاطہ کئے ہوئے ہے جسے ایک مندر کے کھنڈر پر بابر نے تعمیر کرایا ہے" جیسا کہ سب کو معلوم ہے گزیٹیر تاریخی دستاویز نہیں ہوتی بلکہ انتظامی امور کی سہولت کے لئے اسے سرکاری افسران مرتب کرتے ہیں۔ انگریزی حکمرانوں کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ اس ملک کے لوگ متحد نہ ہونے پائیں تاکہ ان کی حکومت قائم رہ سکے۔ اب انگریزوں کا یہ کام جناب کھنہ صاحب اور وشو ہندو پریشد نے سنبھال لیا ہے اور انگریزوں کے چھوڑے ہوئے ادھورے کام کی تکمیل کر رہے ہیں۔

ولیم ارسکن، آنند بروکٹ ولیم اور بیورج جنھوں نے بابر کے عہد کی تاریخ لکھی ہے، بابر کے کسی مندر منہدم کرنے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے اور نہ یہ لکھا ہے کہ اس قسم کے اقدام سے ہندوؤں میں اشتعال پیدا ہوا اور انھوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی۔

بابر کے عہد کی معتبر تواریخ اس کی شاہد ہے کہ بابر کو مندروں کو منہدم کرانے کا کوئی شوق نہیں تھا، درحقیقت بابر جس شہر سے گذرتا تھا اس کے اہم مندروں کو بھی دیکھنے جایا کرتا تھا۔ بابر دور اندیش، وسیع القلب اور مذہبی رواداری کا حامل تھا اور کسی قسم کا کٹرپن اس میں نہیں

تھا، ہندوستان کے عوام کے بارے میں اس کا نقطہ نظر اس وصیت سے ظاہر ہوتا ہے جسے اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کے لئے تحریر کیا تھا۔ اس وصیت میں وہ لکھتا ہے کہ "تمھارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر قسم کی تنگ نظری سے گریز کرو۔ لوگوں پر انصاف کے ساتھ حکومت کرو۔ گائے کا گوشت کھانا ترک کر دو تاکہ لوگوں کے دل جیت سکو۔ وہ لوگ تمھاری حکومت کے ممنون رہیں گے۔ قانون کی پابندی کرنے والے لوگوں کے مذہبی مقامات کو کبھی منہدم نہ کرنا۔ اس طرح انصاف کرو کہ لوگ اپنے بادشاہ سے محبت کرنے لگیں اور بادشاہ عوام سے۔"

اکبر کی مذہبی رواداری بابر اور ہمایوں سے بھی بڑھی ہوئی تھی لیکن اس پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے اجودھیا پر فوج کشی کی۔

اس تماشہ میں جناب کھنہ صاحب اور وشو ہندو پریشد تنہا نہیں ہیں۔ حکومت کا کردار بھی کچھ قابل ستائش نہیں رہا ہے۔ جب اجودھیا کی پولیس نے دسمبر ۱۹۴۹ء میں مسجد پر قبضہ کرنے اور مورتی نصب کرنے کا کیس درج کیا تو حکومت نے دخل اندازوں کو نکالنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا وہ معاملے کو ٹالتی رہی، اور مسلمانوں کو یہ صلاح دی کہ عدالت سے رجوع کریں، چنانچہ مسلمانوں نے عدالت میں مقدمہ داخل کر دیا۔ ہمارے ملک کی عدلیہ کا یہ پہلو افسوسناک ہے کہ ۳۶ سال گزرنے پر بھی یہ مقدمہ ابتدائی منزل میں ہی ہے۔ بہرحال حکومت نے بھی عدالت میں داخل شدہ اپنے بیان میں تسلیم کیا ہے کہ یہ مسجد خدا کی عبادت کے لئے ہے لیکن افسروں نے اس عمارت میں پوجا پاٹ کی اجازت دے دی اور مسجد کے اردگرد مسلمانوں کا داخلہ ممنوع کر رکھا ہے۔

اس واقعہ کا سب سے افسوسناک پہلو حکومت اتر پردیش کا کردار ہے ایک طرف تو اس نے یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ عمارت مسجد ہے اور دوسری جانب اپنی سرکاری مطبوعات کے ذریعہ حق کے خلاف انتہائی مکروہ پروپیگنڈہ کر رہی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا ماہانہ رسالہ "اتر پردیش" جسے محکمہ اطلاعات شائع کرتا ہے کے سالیت واک (اپریل ۱۹۸۲ء) میں اس کے متعلق مسلم دشمن مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ اس کی کچھ مثالیں یہاں دی جا رہی ہیں "ہمارے سماجی اختلافات کا فائدہ اٹھا کر حملہ آور سارے ملک میں پھیل گئے، مندر منہدم کئے گئے، مورتیاں توڑی گئیں، مسلمانوں اور مسلمان حاکموں نے تبدیلی مذہب کے لئے دھمکانے اور لالچ دلانے کی پالیسی اپنائی۔ اس طرح کا سماجی بحران بھارت

کی تاریخ میں کبھی نہیں آیا تھا۔" (صفحہ ۳۱)

"قرون وسطیٰ کی ابتدا میں اس نے (اجودھیا نے) مسلم حکمرانوں کے تحت پھر سیاسی اہمیت حاصل کر لی اور صوبہ کا دارالسلطنت بن گیا۔ یہ اس وقت بھی ہندوؤں کا مقدس مقام تھا لیکن مسلم حملہ آوروں میں غازی میاں نے کئی مندروں کو برباد کر دیا۔ چونکہ اجودھیا کے سریواستو حاکم طاقتور تھے اس لئے وہ اور زیادہ تباہی لانے کی ہمت نہ کر سکا۔ مسلمانوں کے حملے کے وقت جنم استھان، سورگ دوار اور ترتیہ کے ٹھاکر کے تین خاص مندر تھے۔"

"۱۸۲۵ء میں بابر یہاں آیا، وہ یہاں ایک ہفتہ تک رہا، اس نے جنم استھان مندر کو منہدم کرا کے ایک مسجد تعمیر کرائی جو اس مندر کے ملبے سے تعمیر کی گئی، اس کے کئی در اب بھی اچھی حالت میں ہیں۔ مندر کے انہدام کے باعث مسلمانوں اور ہندوؤں میں کشیدگی بڑھ گئی۔" (صفحہ ۲۷)

ریاستی حکومت محکمہ اطلاعات نے وشو ہندو پریشد کو بھی مات کر دیا ہے۔ اس نے قابل تعظیم شخصیتوں کو ملوث کر کے انھیں دشنام طرازی کا ہدف بنا دیا۔

ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں تنہا بابری مسجد قبضہ مخالفانہ میں نہیں ہے جسے غیر مذہبی طور پر استعمال کیا جا رہا ہو۔ حکومت ہند کی وزارت قانون کے محکمہ وقف کے ایک جائزہ میں کہا گیا ہے کہ پنجاب اور ہریانہ میں ایسی مسجدوں کی تعداد ۹۶۲۰ ہے۔ حکومت مغربی بنگال کے مطابق کلکتہ میں ۵۹ مسجدیں غیر مسلموں کے قبضہ میں ہیں (مغربی بنگال اسمبلی میں سوال نمبر ۱۲۷۵ مورخہ ۸۵/۱۰/۷ کا جواب) اور ۹۲ مسجدیں دہلی میں غیر مسلموں کے قبضہ میں ہیں۔ (راجیہ سبھا میں سوال نمبر ۲۵۹۸ مورخہ ۸۳/۱۲/۲ کا جواب)

بابری مسجد کے مندر ہونے کا دعویٰ محض بے بنیاد اور صداقت سے عاری ہے۔ اس دعوے کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے، یہ محض من گھڑت کہانیوں پر مبنی ہے اور اس کا مقصد ہندوستان کے باشندوں میں پھوٹ اور نفرت پیدا کرنا ہے۔

میں ان تمام لوگوں سے جو ہندوستان کی یکجہتی اور اتحاد کے طرفدار ہیں یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ متحد ہو کر ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے ہندوستان مذہبی نفرت اور جنون کے گڑھے میں گرنے سے بچ سکے اور اس مسئلہ کو حل کیا جا سکے۔

(ماخوذ از مسلم انڈیا دسمبر ۱۹۸۶ء)

غزل

"عزیز الدین عزیزؔ جنوبی ہند (کرناٹک) کے ایک ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ہیں۔ آپ کی شخصیت جنوبی ہند میں ایک معروف شخصیت ہے۔ آپ کی شرکت مشاعروں کی کامیابی کی دلیل ہے۔ آپ انقلابی تعمیری اور اسلامی ادب کے نقیب ہیں۔ آپ کی غزلیں حسن تغزل کی بہترین مثال ہوتی ہیں۔ اور سامعین کے دل کو زیر و زبر کر دیتی ہیں۔ آپ کی یہ نعت بہت مشہور ہے۔

ہر ستم کے تیر کھا کر گل برسانے والا وہ — اور دعا کے واسطے اپنے ہاتھ اٹھانے والا وہ
اس سے نسبت خاص کے ہر دم جو گن گن چلتے ہیں ہم — اور عمل کے سب دلائل میں ہم سب کو جانے والا وہ

اور اب تازہ غزل۔ "

غم اٹھانا اب ضروری ہو گیا — چین پانا اب ضروری ہو گیا
بے ضرر جذبات و احساسات کا — سر اٹھانا اب ضروری ہو گیا
عافیت کی زندگی جیتے رہے — چوٹ کھانا اب ضروری ہو گیا
جاہلیت کے سبھی افعال کو — بھول جانا اب ضروری ہو گیا
گونج اٹھے جس سے ساری کائنات — وہ ترانہ اب ضروری ہو گیا
نغمۂ توحید دارالکفر میں — گنگنانا اب ضروری ہو گیا
تختۂ دار و رسن کو دیکھ کر — مسکرانا اب ضروری ہو گیا
تم ہی کہہ دو نغمۂ دل اے عزیزؔ
کیوں سنانا اب ضروری ہو گیا

عزیز الدین عزیزؔ بلگام (کرناٹک)

ڈاکٹر اشفاق احمد کا انٹرویو

مدیر مجلہ حیات نو کے نام ایک خط

نوٹ:۔ "مراسلہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔"

بخدمت جناب مدیر حیات نو

حیات نو کے تازہ شمارے میں ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی کا انٹرویو فکر انگیز ہے۔ انھوں نے جماعت اسلامی کی صورت حال کا اچھا تجزیہ کیا ہے اور اہل جماعت کو اس پر غور کرنا چاہیے لیکن بعض امور شاید ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں نہیں ہیں۔ پاکستان کی جماعت نے مولانا مودودی رحمۃ اللہ کے زیر قیادت وہاں اسلامی ریاست کے قیام کی ایک ایسی تیز مہم چلائی کہ آج اس ملک میں کسی جماعت کے لئے نظام اسلامی کا نعرہ لگائے بغیر عوام کے درمیان کام کرنا مشکل ہے۔ وہاں حکومت وقت نظام اسلام کو اپنی منزل قرار دے رہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مولانا کی وفات کے بعد وہاں سیاسی قیادت کا فقدان سا ہو گیا ہے اور اہل جماعت حسب توقع تدبر کا زیادہ ثبوت نہیں دے رہے۔ مثال کے طور پر میرے خیال میں وہاں دوسرے سیاسی عناصر کے مقابلے میں صدر ضیاء الحق کے ساتھ تعاون کیا جانا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ اپوزیشن میں نہ صرف انتشار ہے بلکہ صریح مفاد پرستی اور گروہ بندی ہے۔ پھر اسلام کا اقرار و اعلان بھی سب سے زیادہ ضیاء الحق صاحب ہی کر رہے ہیں جبکہ اپوزیشن کے متعدد عناصر اسلامی نظریے کے لئے مخلص نہیں معلوم ہوتے۔

اسی طرح ہندوستان میں جماعت نے کم از کم ووٹ کی اجازت دے کر صحیح سمت میں قدم اٹھایا ہے۔ اور یہ ہندوستان گیر سطح پر جماعت کے اندر کے فعال عناصر کا تقاضا تھا۔ کام کرنے کے لئے نظریاتی اور عملی سطحوں کے درمیان تیز و تفریق مناسب نہ ہوگی۔ اس لئے کہ ملت کے مسائل سے صرف نظر کر کے محض نظریاتی وعظ ایک غیر عملی اور بے نتیجہ کوشش ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ ملت

ووٹ کا مطلب ووٹ پرستی ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ درحقیقت اس وقت پورے ملک بشمول ملت کے تمام اجتماعی مسائل کے حل کی جدوجہد ہی جماعت کو موثر طور پر اسلام کا پیغام بلا امتیاز تمام باشندوں تک پہنچانے کے قابل بنا سکتی ہے۔ سیاست کو ایک عرصے تک شجر ممنوعہ قرار دے کر ہندوستان کی جماعت نے حقیقت پسندی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ گرچہ بہت دیر ہو چکی ہے مگر اب مزید وقت ضائع کئے بغیر جماعت کو عوامی سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔ عوامی سیاست کا مطلب سیاست برائے اقتدار یعنی آج کی اصطلاح میں پارٹی اور پارلیمنٹری پالٹکس ہی نہیں ہے، گرچہ پارلیمانی سیاست کو بھی شجر ممنوعہ بنانے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے۔ صرف اقدام میں ایک تدریج و ترتیب مناسب ہوگی۔ اس مقصد کے لئے سب سے بڑی اور فوری اصلاح جماعت کو اپنے نظام تربیت میں کرنی ہوگی اور قدیم انداز کا خانقاہی تقشف چھوڑ کر تجرد و تزکیہ کے بجائے صرف معروف تقویٰ کو معیار بنا کر تنظیم کا دروازہ ان سب متحرک و فعال افراد کے لئے کھولنا ہوگا جو اسلام کو پوری زندگی کا دین سمجھ کر ہر راہ عمل میں شہادت حق ادا کرنے کے لئے بے قرار ہیں، خواہ وہ فوق البشری حد تک معصوم نظر نہ آتے ہوں۔

ڈاکٹر اشفاق صاحب نے ان لوگوں پر صحیح گرفت کی ہے جو طاغوت کے بجائے الناس کی (معقول) منطق بگھار کر حقائق سے فرار کا فلسفیانہ و صوفیانہ انداز اختیار کر رہے ہیں۔ الناس تو بہت عام لفظ ہے اور ناس ہی میں قرآن کے مطابق خناس بھی ہوتے ہیں جو یقیناً طاغوت یا اس کے چیلے ہیں اور ان کا اسی طرح تشخص کیا جانا چاہئے ورنہ خدنگ عمل ہدف سے بھٹک جائے گا۔ الناس کی بوالعجبی کا آخر مطلب کیا ہے؟ کیا کوئی نیا رسول آئے گا جو الناس کو مخاطب کرے گا اور وہ اس کا انکار کرے گا، تب طاغوت جنم لے گا؟ رسول تو آ چکے، اب جو لوگ بھی منکر ہیں ان کا تعلق طاغوت ہی سے ہے۔ خواہ وہ باطل کے امام ہوں یا مقتدی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اسلام کا پیغام قرآن کے مطابق موعظہ حسنہ کے ساتھ ساتھ حکمت کے طریقے سے ان سب لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے جو اسلام سے واقف نہ ہوں یا اس حقیقت کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔

عبدالمغنی، عالم گنج، پٹنہ ۷

۶ر فروری

ملک عطا رشید عطا

غزل

جب بے نقاب جلوۂ زینت بدل نہ جائے
عشق خدا صنم کی خواہش میں ڈھل نہ جائے

ہے کشمکش فضا میں گلشن مسل نہ جائے
یہ موسم بہاراں پل میں بدل نہ جائے

ہر موڑ ہر ڈگر پہ توبہ شکن ہیں منتظر
ڈر ہے کہ زہد و تقویٰ ان پر مچل نہ جائے

عقبیٰ کی فکر توں سے ہراساں ہے یہ خطرہ
دنیا کی لذتوں میں انساں بہل نہ جائے

جدوجہد ہماری پیہم رہے گی جاری
جب تک چراغ دیں کا ہر گھر میں جل نہ جائے

ہوتا ہے کون کس کا اس دور میں سہارا
ساتھی ہے ساتھ جب تک مطلب نکل نہ جائے

قول و قرار اس کا سمجھے نہ کوئی پختہ
خوف خدا سے جس کا سینہ دہل نہ جائے

طاغوت کی قیادت جس کے لئے ہو رحمت
وہ راہ حق سے آخر کیسے پھسل نہ جائے

پر خار جھاڑیوں سے جنت گھری ہے لیکن
نادان ہے وہی جو بچ کر نکل نہ جائے

ہاتھوں سے اپنے خود ہی اپنے گلے پہ یارو!
کار گناہ بن کر تلوار چل نہ جائے

بے جا ہوس ہے فتنہ، فتنہ ہے ایک اژدر
انسانیت کا جوہر اژدر نگل نہ جائے

جان عزیز تک کی بازی لگا دو لیکن
ایماں کا ہے تقاضا حسن عمل نہ جائے

ہوتا نہیں ہے ہرگز امن و سکوں میسر
جب تک بلائے باطل ہر سر سے ٹل نہ جائے

یاروں کے قافلو! تم ہاں آؤ جاؤ لیکن
مشکل گلی ہے نازک پیروں پھسل نہ جائے

چاروں طرف ہیں کفر کے پھیلے ہوئے شعلے
رہنا سنبھل کے چلنا ایمان جل نہ جائے

جرأت نہیں ہے اس پر حق کی عطائے الفت
سوز جنوں سے جو دل یکسر پگھل نہ جائے

خصوصی انٹرویو

اتحاد اسلامی مجاہدین افغانستان کے ترجمان
گلبدین حکمت یار سے ایک اہم گفتگو

ملاقات۔ رفیق افغان

ہم نے سُرخ سامراج
کے ناقابلِ شکست ہونیکے
تصوّر کو پاش پاش کردیا ہے

۲۰ دسمبر کی خنک شام تھی، پشاور شہر صبح سے مسلسل ترشح کا شکار تھا۔ ہلکی ہلکی بارش کا سلسلہ کافی دیر سے جاری تھا۔

میں عصر کی نماز سے فارغ ہوا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف سے حزب اسلامی افغانستان کی سیاسی کمیٹی کے ایک اہم رکن اور پریس پبلیکیشنز کے انچارج محترم سعید بول رہے تھے۔

دراصل میری پشاور آمد کا مقصد چند دیگر امور کے علاوہ اتحاد اسلامی مجاہدین افغانستان کے موجودہ ترجمان اور افغانستان میں لڑنے والے مجاہدین کی سب سے اہم اور فعال جماعت حزب اسلامی افغانستان کے امیر انجینئر گلبدین حکمت یار سے ایک خصوصی انٹرویو بھی کرنا تھا

یہ انٹرویو افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد کے چھٹے سال جو ۲۷ دسمبر کو پورا ہو رہا ہے کے تناظر میں خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اس سلسلے میں میں نے پشاور پہنچنے کے فوراً بعد ہی ان کے ڈائریکٹر پریس اینڈ پبلیکیشنز سعید صاحب سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔

چنانچہ انہوں نے حسب وعدہ مجھے مطلع کیا کہ میں ٹھیک ساڑھے چھ بجے حزب اسلامی افغانستان کے مہمان خانے میں پہنچ جاؤں جہاں حکمت یار صاحب موجود ہوں گے۔ ٹھیک وقت پر میں اپنے ایک اور ساتھی کے ہمراہ جو عارضی طور پر کیمرہ مین کے فرائض انجام دینے کے لیے میرے ساتھ تھے، حزب اسلامی افغانستان کے مہمان خانے پہنچ گیا۔

بارش کا سلسلہ رک چکا تھا لیکن فضا میں نمی کی موجودگی اور خنکی بہت نمایاں تھی۔

مہمان خانے کے کمرہ کی گرم فضا بڑی خوشگوار تھی۔ یہ ایک انتہائی سادہ کمرہ تھا جہاں کچھ افراد پہلے ہی سے موجود تھے۔ تعارف سے معلوم ہوا کہ یہ افغانستان کے مختلف صوبوں کے کمانڈر ہیں جو اپنے امیر سے مشورے اور ہدایات لینے حاضر ہوئے ہیں۔

میں نے ہر فرد کا بغور جائزہ لیا، ایک بات انتہائی نمایاں طور پر محسوس ہوئی کہ سب کے سب کمانڈر نوجوان تھے، تنظیم، وقار اور شائستگی کا اظہار نمایاں تھا۔ ان کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی بجلیاں، انداز میں آہنی عزم اور گفتگو میں اعتماد، ان کے جذبۂ ایمانی کا بھرپور ترجمان تھا۔

ٹھیک ساڑھے چھ بجے بیرونی گیٹ کے کھلنے اور ایک جیپ کے اندر آنے کی آواز آئی۔ پھر چند لمحوں بعد ایک سادہ لباس میں ملبوس بلند سر اپار کھنے والا نوجوان جس کے انداز میں بے پناہ وقار تھا کمرے میں داخل ہوا۔ ان کے داخل ہوتے ہی کمرے میں موجود تمام افراد کھڑے ہو گئے یہ انجینئر گلبدین حکمت یار تھے۔

انہوں نے کمرہ میں موجود تمام افراد سے معانقہ و مصافحہ کیا اور پھر ہمارے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

کھلتی ہوئی رنگت، سیاہ داڑھی، انتہائی گہری اور سوچ میں ڈوبی ہوئی مگر روشن اور چمکدار آنکھیں، سر پر عام سی افغانی ٹوپی۔ اور کندھوں پر ایک چادر لیے ہوئے اس عظیم مجاہد

کا سراپا میرے سامنے تھا۔ جس کا نام نہ صرف پورے افغانستان کے طول و عرض میں گونج رہا تھا بلکہ دریائے آمو کے دوسری طرف وسط ایشیا کے تمام مسلمان علاقوں کے دلوں کی دھڑکن بنا ہوا ہے۔ جس کا نام روسیوں اور ببرک کارمل کی ناجائز حکومت کے ایوانوں کو لرزہ براندام کر رہا ہے جس کے زیر قیادت افغانستان کے ۲۹ صوبوں میں مجاہدین اپنے خون سے جدوجہد اور قربانی کی لازوال تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔

انجینئر گلبدین حکمت یار جنہوں نے اپنی نوجوانی کے ابتدائی دنوں ہی سے کمیونزم کے آنے والے طوفان کا اندازہ لگا لیا تھا، اپنی عمر کا بیشتر حصہ افغانستان کے ان نوجوانوں کو جن کی دینی

گوریلا جنگ کے بعد اب ہم روس سے
باقاعدہ جنگ کے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں

حمیت انہیں کمیونزم کے خلاف آواز بلند کرنے پر مجبور کر رہی تھی، یکجا کرنے اور انہیں منظم کرنے میں گزارا۔ اس جہاد مسلسل میں کہ جو ظاہر شاہ کے دور سے شروع ہوا، سنت ابراہیمی کی پیروی میں انہیں اپنے خاندان کے بیشتر افراد خدا کی راہ میں قربان کر دینے پڑے۔ اپنی تمام جائداد اور زمینوں سے دستبردار ہونا پڑا۔ لیکن ان کی جہد مسلسل اور عزم میں کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوا۔ اور آج وہ مجاہدین افغانستان کی سب سے وسیع، انتہائی منظم اور بھرپور قوت رکھنے والی تنظیم حزب اسلامی افغانستان کے سربراہ ہیں۔ انہوں نے اس تنظیم اور جہاد کی آبیاری اپنے خون سے کی ہے۔

انہوں نے اپنی عمر کا وہ حصہ جب دھوپ سنہری ہوتی ہے اور سائے دھانی ہوتے ہیں جیل کی سنگلاخ سلاخوں کے پیچھے اور اسلامی نظریۂ حیات کی ترویج اور کمیونزم کی بیخ کنی کے لیے پورے افغانستان میں جہاد کو منظم کرنے، مجاہدین افغانستان میں پلٹ کر جھپٹنے اور جھپٹ کر پلٹنے کی خفیہ عقابی قوتوں کو بیدار کرنے میں لگایا ہے اور اس عقابی روح کی بیداری کے بعد اب انہیں اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔ ان کے روز و شب آج بھی قرون اولیٰ کے مجاہدین کی طرح میدان جہاد میں دشمن کا مقابلہ کرنے اور راتوں کو اپنے رب کے حضور نالۂ نیم شبی

میں گزرتے ہیں۔

انٹرویو کے آغاز پر میں نے پہلا سوال ان کے ماضی کی درخشندہ یادوں کے حوالے سے کیا میرا سوال یہ تھا کہ۔

اپنی زندگی اور حزب اسلامی کے بنیادی تعلق کے حوالے سے ماضی کی کچھ باتیں بتائیے۔ آپ کی پیدائش کہاں؟ تعلیم کس جگہ اور اسلامی فکر سے تعارف کیسے ہوا؟ حزب اسلامی کی بنیاد کب اور کہاں پڑی؟ آپ کے ابتدائی ساتھیوں میں کون کون تھا اور اب ان میں سے کتنے موجودہ جہاد میں شریک ہیں؟

اس سوال کا جواب دینے میں ان کی طرف سے ہچکچاہٹ نمایاں تھی، ان کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں تذکرہ کرنا اور اپنی ابتدائی زندگی کے احوال کی تفصیلات بتانا شاید اپنے آپ کو دیگر ساتھیوں کے مقابلے میں نمایاں ظاہر کرنے کے مترادف سمجھتے ہیں۔

ان کی یہ ہچکچاہٹ میں نے اپنے مسلسل اصرار اور اسے انٹرویو کی ایک اہم ضرورت بتا کر دور کرنا چاہی اور انہیں بتلایا کہ تاریخی ریکارڈ کی درستگی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اور حزب اسلامی کے ابتدائی ایام کا احوال درست طور پر رکھنے کے لیے خود اپنی زبان سے وہ تفصیلات دہرائیں جو عموماً دوسروں سے سنی جاتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں غلط فہمیوں کا احتمال رہتا ہے۔

بادل ناخواستہ وہ اس بات پر آمادہ ہوئے اور انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

ان کا لہجہ دھیما لیکن متوازن اور مضبوط، انداز تکلم دل موہ لینے والا اور متاثر کن تھا ان کا چہرہ اور آنکھیں ان کی گفتگو کی بھرپور ترجمان تھیں۔

انہوں نے بتایا کہ "میرے والد نے غزنی سے قندوز کی طرف ہجرت کی تھی اور میں قندوز کی ایک والسوالی "امام صاحب" میں جو دریائے آمو سے تقریباً ۱۲ کلومیٹر دور ہے میں پیدا ہوا میری تعلیم چھٹی جماعت تک وہیں ہوئی۔ چھٹی جماعت کے بعد کابل کے عربی اسکول میں داخل ہو گیا اور آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دوبارہ قندوز چلا گیا اور بارہویں تک تعلیم وہیں کے ایک اسکول "شیر خان لیسہ" میں مکمل کی، اس کے بعد دوبارہ کابل آیا اور کابل یونیورسٹی کی

انجینئرنگ فیکلٹی میں داخلہ لے لیا۔

میں دسویں میں تھا کہ کمیونسٹوں نے اپنی ابتدائی سرگرمیوں کا آغاز فعال طریقے پر افغانستان میں کیا۔ مجھے اسی وقت یہ احساس ہوگیا تھا کہ اگر ان سرگرمیوں کا سدباب نہ کیا گیا تو یہ مستقبل میں افغانستان کے لیے ایک خطرہ ثابت ہوں گی۔ اس وقت مجھے مسلمانوں کی کم مائیگی اور دینی احساس زیاں بڑی شدت سے محسوس ہوا۔ میری خواہش تھی کہ اسلامی فکر رکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم پر کسی بھی طریقے سے جمع کیا جائے۔ اور ان کی ایک تنظیم وجود میں لائی جائے۔ اس احساس کے پیش نظر ۱۹۶۹ء میں کابل یونیورسٹی میں ایک اسلامی تنظیم کی اساس ڈالی گئی۔ اس کے سیشن میں ۱۲ افراد شامل تھے جن کے نام یہ ہیں۔ انجینئر عبدالرحیم نیازی، مولوی حبیب الرحمٰن گل محمد، انجینئر حبیب الرحمٰن، سیف الدین نصرت یار، غلام ربانی عطش، استاد غلام حبیب، عبدالقادر توانا، سید عبدالرحمان، انجینئر گلبدین حکمت یار، خواجہ محفوظ منصور، اور ڈاکٹر محمد عمر۔

ہم نے نوجوانانِ مسلمان کے نام سے کام شروع کیا اور ہمارا سب سے پہلا کام شب نامے تیار کرنا اور انہیں مختلف عوامی مقامات پر چسپاں اور تقسیم کرنا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب کمیونسٹوں کو سیاسی کام کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ دراصل روس کی حکومت نے اس وقت کے حکمران ظاہر شاہ سے سیاسی اور فوجی معاہدے طے کرتے وقت یہ شرط عائد کی تھی کہ اندرون افغانستان کمیونسٹوں کو سیاسی کام کرنے، اخبار نکالنے، دفتر قائم کرنے، جلسہ اور جلوس منعقد کرنے، نیز ممبر شپ کو وسیع پیمانے پر پھیلانے اور اندرون پارٹی عام انتخابات کرانے کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں افغانستان میں کمیونزم کے لیے کام کرنے اور اس کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والوں کا ایک مخصوص گروہ پیدا ہوگیا جو اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کے لیے پورے فعال طریقے سے کام کرتا رہا۔

اس کے برعکس اسلامی ذہن اور فکر کے حامل افراد کے لیے سیاسی محاذ پر کام کرنے میں سخت دشواریاں تھیں۔ اپنی تمام تر خودسری اور شورشوں کے باوجود کمیونسٹوں میں کبھی کسی کو گرفتار نہیں کیا گیا اور انہیں کبھی جیل میں نہیں ڈالا گیا۔

ہماری تنظیم کی فعالیت ابتداء میں بہت محدود تھی لیکن آہستہ آہستہ ہم آگے بڑھتے

گئے اور کارواں بنتا گیا۔ کچھ عرصے بعد ہم نے بھی جلسہ اور جلوس منعقد کرنے شروع کر دیئے۔ اگرچہ حکومت کی بھرپور کوشش یہی تھی کہ کسی طرح ہماری سرگرمیوں کو کچل دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں فضل و کرم سے ہمارے محدود وسائل کے باوجود ہمیں اپنی حفاظت میں رکھا اور ہم اسلامی انقلاب کے راستے پر تیزی سے گامزن رہے۔

۱۹۷۰ء میں ہمارے ایک اہم ساتھی استاد عبدالرحیم نیازی بیمار ہونے کی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہوگئے۔ ہمیں یہ اطلاعات ملیں کہ حکومت نے انہیں ہسپتال میں ہی ختم کر دینے کا منصوبہ

فلسطینیوں کے برعکس ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ سیاسی محاذ پر دنیا کی کوئی بھی حکومت ہماری پشت پناہی نہیں کر رہی ہے

بنالیا ہے، چنانچہ ہم نے انہیں کسی طرح ہسپتال سے نکلوا کر ہندوستان بھجوا دیا جہاں وہ وفات پاگئے۔ ان کی وفات ہماری تحریک کے لیے ایک عظیم نقصان سے کم نہ تھی۔ لیکن چونکہ ہم نے اپنی تحریک کو افراد کے بجائے اصولوں کے بل بوتے پر استوار کیا تھا۔ اس لیے ہماری رفتار میں کمی نہیں آئی۔

کچھ عرصے بعد ہم نے اپنی تنظیم کی مجلس عاملہ کے خفیہ انتخابات منعقد کرائے جس میں ۲۷۰ سے بھی زیادہ ارکان نے حصہ لیا۔ یہ انتخابات رائے دہندگی کی بنیاد پر خفیہ طریقے سے منعقد ہوئے۔

ان انتخابات کے نتیجے میں ۱۰ افراد پر مشتمل مجلس عاملہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان افراد میں انجینئر حبیب الرحمٰن، مولوی حبیب الرحمٰن، انجینئر سیف الدین نصرت یار، استاد غلام ربانی عطش اور انجینئر گلبدین حکمت یار شامل تھے۔

اگرچہ انتخابات خفیہ طریقے پر ہوئے تھے۔ لیکن یہ خبر اخبارات تک پہنچ گئی کچھ عرصے کے اندر اندر اس تحریک نے مزید قوت حاصل کرلی۔ اور خصوصاً نوجوانوں اور طالبعلموں میں اس کی مقبولیت دم بدم بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی میں نئے آنے والے طالبعلموں کی اکثریت اس تحریک سے منسوب ہونے لگی جس کے نتیجے میں یونیورسٹی کے انتخابات کے موقع

... سے ۱۱ جماعتوں میں ہماری تحریک کے نامزد کردہ نمائندے منتخب ہو گئے۔

یہ حال دیکھ کر کمیونسٹوں کے اوسان خطا ہو گئے اور انہوں نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔ چنانچہ ان کے ساتھ ایک جھڑپ کے نتیجے میں میں، سیف الدین نصرت یار، ڈاکٹر محمد عمر، انجینئر حبیب الرحمٰن گرفتار کر لیے گئے اور ہمیں جیل پہنچا دیا گیا۔ میں تقریباً ڈیڑھ سال جیل میں رہا اور سب سے آخر میں رہا ہوا۔

اس دوران یونین کے انتخابات میں ہماری واضح اکثریت دوبارہ ظاہر ہو گئی جبکہ ہمارے خلاف ساری تنظیمیں اور مختلف نظریات کے حامل لوگ اکٹھے ہو گئے تھے، ہماری کابل یونیورسٹی میں اکثریت اور قوت کی وجہ سے کمیونسٹوں کو یہ ہمت بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ یونیورسٹی کی حدود میں جلسہ بھی کر سکیں، علمی اور فکری طور پر وہ نوجوانوں میں اپنے اثرات مرتب کرنے میں بالکل ناکام ہو گئے، ان تبدیلیوں سے کمیونسٹوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ اگر یہ تحریک اسی طرح جاری رہی تو ان کی گزشتہ کئی سالوں کی محنت اور سرمایہ رائیگاں چلا جائے گا۔ اور کچھ عرصے کے بعد ان کی بقاء کو بھی خطرہ لاحق ہو جائیگا۔

چنانچہ انہوں نے پہلے قدم کے طور پر ظاہر شاہ کی حکومت کو ختم کرنے اور داؤد کو برسر اقتدار لانے کے لئے فوج میں اپنے پھیلے ہوئے اثرات کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ تبدیلی براہ راست ظاہر شاہ سے کمیونسٹ انقلاب کی طرف ہوئی تو انہیں عوام کی طرف سے شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑے گا، چنانچہ داؤد کو برسر اقتدار لانے کا پروگرام طے پایا، اور بالآخر فوج میں اپنے حامی عناصر کی مدد سے انہوں ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا، داؤد برسر اقتدار آ گیا اور اس کی کابینہ میں خلق اور پرچم سے تعلق رکھنے والے افراد کی شمولیت سے نئی حکومت نے کام کا آغاز کیا۔ لیکن درحقیقت اصل اقتدار ان فوجی افسروں کے پاس تھا جو روس سے تربیت یافتہ تھے، اور کمیونسٹ پارٹی سے ان کا گہرا تعلق تھا۔

سردار داؤد نے حکومت سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے خطاب میں حکومت کی تبدیلی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا کہ رجعت پسند قوتوں کی طاقت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے ترقی پسند قوتوں اور ملکی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا ہم نے اس خطرہ کی طرف اپنے ہمدردوں اور

فوج میں اپنے حامیوں کی توجہ مبذول کروائی چنانچہ اس کے بعد تحریک اسلامی کے رہنماؤں اور وابستگان کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا اور میں چھ ماہ تک جیل میں رہا، رہائی کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم زیرِ زمین کارروائیوں اور گوریلا جنگ کا آغاز کریں گے۔

حکومت کے شدید دباؤ اور مسلسل گرفتاریوں کے سبب ہم نے پاکستان کی طرف ہجرت کی۔ لیکن ہم پہلے طے کر چکے تھے کہ ہم اپنی مربوط کارروائیوں کا آغاز داؤد کی حکومت کے خلاف پورے افغانستان میں کریں گے۔ چنانچہ ہم نے اندرونِ افغانستان اپنے لوگوں کی تربیت کا سلسلہ شروع کیا۔ عسکری تربیت دینے کی یہ خدمت ہماری اپنی فوج کے وہ افسر جو ہمارے ساتھ شامل تھے انجام دیا کرتے تھے۔ پھر ہم نے داؤد حکومت کے خلاف اپنی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔

افغانستان کے کئی صوبوں میں حکومت کے دفاتر اور سرکاری تنصیبات پر حملے شروع ہو گئے اور یہ سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔ ادھر داؤد نے محسوس کر لیا کہ وہ اس تحریک کو دبا نہیں سکے گا کیونکہ افغان عوام کا بہت بڑا حصہ اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ اور کمیونسٹوں سے اس کا ربط اس کی حکومت کے لیے عوامی نفرت کا سبب بن رہا ہے چنانچہ اس نے قوم کو اپنے اعتماد میں لینے اور کمیونسٹوں سے دور ہونے کا فیصلہ کیا۔ اپنی حکومت میں شامل بعض کمیونسٹ وزیروں کو نکال دیا، اور ان کی جگہ ایسے افراد کو اپنی کابینہ میں شامل کیا جو اسلام پسند مشہور تھے۔ اس کے بعد اس نے پاکستان، ایران، مصر، سعودی عرب کا دورہ بھی کیا جونہی روسیوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ داؤد ان کے ہاتھ سے نکل رہا ہے انہوں نے ایک اور "کودتا" کی تیاری شروع کی۔

> **داؤد حکومت کے خلاف فوج کے اسلام دوست عناصر کے تعاون سے ہم انقلاب لانے کی تیاری کر چکے تھے لیکن کمیونسٹ پہل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔**

ادھر فوج میں تحریک اسلامی کے بڑھتے ہوئے اثرات کے پیش نظر کمیونسٹوں کے لیے یہ مشکل ہوتا جا رہا تھا کہ وہ فوج کو دوبارہ استعمال کریں، وہ اس انتظار میں تھے کہ اسلامی تحریک

اور داؤد کے درمیان بڑھنے والی کشیدگی کو اس درجے پر پہنچا دیا جائے کہ خانہ جنگی شروع ہو جائے اور پھر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقتدار کا تخت دوبارہ الٹ دیا جائے۔ ایسے ان عزائم کا اظہار حفیظ اللہ امین نے اپنی پارٹی کے مخصوص رسالے میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں کیا تھا۔

اسی دوران امیر اکبر خیبر جو کمیونسٹوں کا ایک اہم اور سرگردہ رہنما تھا کچھ لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ردعمل کے طور پر کمیونسٹوں نے دارالحکومت کابل میں مظاہرے شروع کر دیئے اور داؤد حکومت کے خلاف احتجاجی جلوس نکلنے شروع ہو گئے۔ کمیونسٹوں کی اس تحریک کے جواب میں داؤد نے ان کے چند اہم رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ساتھ ہی اس نے انکشاف کیا کہ کمیونسٹوں کے قبضے سے ایسی دستاویزات برآمد ہوئی ہیں کہ جن سے حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا انکشاف ہوتا ہے۔ کمیونسٹوں سے متعلق کئی فوجی افسر زیر زمین چلے گئے کیونکہ ان کے ناموں کا انکشاف ہو گیا تھا۔

اب کمیونسٹ طاقتیں مجبور ہو گئیں تھیں کہ وہ روس کی امداد، سرمایہ اور اسلحے کی مدد سے داؤد حکومت کو ختم کروا دیں اور بزور طاقت حکومت پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے منصوبہ کو عملی شکل دی۔ دراصل ان کا پروگرام تو پہلے ہی حکومت کی تبدیلی کا تھا کیونکہ وہ داؤد حکومت کے بدلتے ہوئے رجحان اور تیکھے تیوروں سے بخوبی آشنا ہو رہے تھے۔ لیکن یہ منصوبہ انہیں فوری طور پر اس لیے روبہ عمل لانا پڑا۔ کیونکہ حکومت نے اس سازش کی بو سونگھ لی تھی۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ حکومت فوج میں کمیونسٹوں کے حامی افسران پر ہاتھ ڈالتی انہوں نے یہ اقدام کر ڈالا۔ غالباً اللہ تعالیٰ کو ہماری آزمائش منظور تھی کہ باوجود منصوبہ رکھنے اور اپنے لوگوں سے فوج میں بھرپور رابطے بنانے کے ہم سے پہلے کمیونسٹوں نے "کودتا" کر لیا جبکہ ہم اپنے تئیں پورا منصوبہ روبہ کار لانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔

دوسری طرف مرنگ جیل سے اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے ہم نے جو سرنگ کھودی تھی وہ مخبری ہو جانے کی بنا پر پکڑی گئی۔ میں اس وقت جیل سے باہر تھا اور باہر کا انتظام میں ہی کر رہا تھا۔ یہ سرنگ جو ایک نانبائی کے تنور سے کھودی گئی تھی۔ اگرچہ پکڑی گئی لیکن اس کے ذمہ داران کا کوئی پتہ نہیں چلا اور حکومت کسی بھی فرد کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔

پچھلے برسوں کی طویل اور بھرپور جدوجہد کے بعد اب میرے ۱۱ سابقہ ساتھی شہید

ہو چکے ہیں اور ابتدائی ۱۲ افراد میں سے فقط میں ہی زندہ ہوں۔ شاید خدا تعالیٰ کو ابھی مجھے شہادت عطا کرنا منظور نہیں ہے۔ وہ مجھ سے بہت بہتر اور افضل تھے جو خالق حقیقی سے جا ملے۔

گرم قہوہ کی چسکیاں لیتے ہوئے میں نے چند ثانیے انتظار کیا اور پھر دوسرا سوال داغ دیا جو مجاہدین کے اختلافات اور مختلف تنظیموں کے مابین کشمکش کی خبروں پر محیط تھا۔ سوال یہ تھا کہ

ابتداء میں تو فقط ایک تنظیم نے کام شروع کیا پھر دوسری تنظیموں کی ابتداء کیسے ہوئی اور ان میں اختلافات کی کیا نوعیت ہے؟ اسماء بریگیڈ کی فتح کے موقع پر مختلف تنظیموں میں جو کشمکش ہوئی اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا موجودہ اتحاد بھی عارضی ثابت ہوگا، جس

مجاہدین کے لیے پہلے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانا دشوار ہوتا تھا لیکن آج خدا کے فضل سے افغانستان کا ۹۰ فیصد علاقہ دشمن سے آزاد کرایا جا چکا ہے۔

طرح پچھلے تین اتحاد بنتے اور ٹوٹتے چلے گئے؟

جواب دینے سے پہلے انجنیئر گلبدین حکمت یار نے ایک لحظہ سوچا ان کی پیشانی پر نمودار ہونے والی لکیریں ان کی گمبھیر سوچ کی عکاسی کر رہی تھیں۔ جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا

یہ درست ہے کہ مقاومت ایک تحریک اور تنظیم نے شروع کی لیکن جب سے مہاجرین کی بڑی تعداد کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا تو افغانستان سے آنے والے افراد نے متعدد تنظیموں کی بنیاد رکھی۔ ان تنظیموں کے بننے کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ ان سب کے نظریات اور مقاصد بھی مختلف ہیں۔ دراصل ہم نے تو ایک متفرق اور منتشر قوم میں اپنی تحریک شروع کی تھی۔ یہ تنظیمیں دراصل تاریخی عوامل کا نتیجہ ہیں چونکہ ہماری قوم بنیادی طور پر منتشر اور قبائلی ساخت کی حامل تھی۔ اس لئے مختلف تنظیموں کا وجود بھی اسی ڈھانچے کے اندر وجود میں آیا۔

ہماری قوم اچھی قیادت اور دینی مصالح سے کافی حد تک محروم تھی۔ چنانچہ دوران جہاد بھی اس قوم کی شیرازہ بندی اور تنظیم کا عمل جاری رہا۔ یہ ایک بڑی بات ہے کہ پوری افغان قوم اپنے ماضی و سابقہ حالات کے باوجود صرف سات تنظیموں کی پشت پناہ ہے۔ آپ ایک ایسی قوم سے جسے کبھی تنظیم اور تربیت سے نہ گزارا گیا ہو۔ اس بات کی توقع کیسے کرتے ہیں کہ وہ جنگ شروع ہوتے ہی یکبارگی ایک پرچم اور لیڈر تلے متحد ہو کر کسی تربیت یافتہ فوج کی طرح جنگ لڑنے لگے گی۔ اور یہ صورت حال تو اتنی فطری ہے کہ ہر ملک میں ہمیشہ ایک سے زیادہ تنظیمیں رہی ہیں خواہ وہ جمہوریت کی جنگ لڑیں یا آزادی کی۔ کسی بھی ملت کو یکبارگی ایک صف میں کھڑا کر دینا آسان کام نہیں ہے اس کے لیے تو حالات امن میں بھی ایک طویل عرصہ چاہیئے۔ اور ہم تو حالات جنگ میں یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ جہاں تک مجاہدین کے اختلافات کے بارے میں افواہوں کا تعلق ہے تو یہ دشمنوں کا پروپیگنڈہ ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کا جو نہیں چاہتے کہ دنیا کے سامنے اسلام میں خصوصاً اور دین میں عموماً جہاد کی صحیح صورت اور جدوجہد سامنے آئے۔

جہاں تک اسماء بریگیڈ کا تعلق ہے تو وہ خالصتاً ایک شخصی اور عارضی اختلاف تھا۔ جس کا نظریاتی یا سیاسی معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ موقع پر پیدا ہونے والے ایک اختلاف کو اسی وقت دور کر دیا گیا، ایسی باتیں تو ہر جگہ ہر وقت ہوتی رہتی ہیں آخر کو یہ جنگ انسان ہی لڑ رہے ہیں، کوئی فرشتے تو نہیں۔ پھر بعض اوقات طبیعتوں کا اختلاف بھی معاملات کو الجھا دیتا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ تمام تنظیمیں اور مجاہدین اپنے نصب العین اور منزل کے بارے میں متفق ہیں اور ان کے ذہن پوری طرح صاف ہیں، ان تنظیموں کا بار بار اتحاد بنانا بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سب متحد ہونا چاہتی ہیں۔ جہاں تک اتحادوں کے بننے اور ٹوٹنے کا تعلق ہے تو درحقیقت اس کے پس پشت متعدد عوامل کارفرما ہیں۔ پردے کے پیچھے بہت سے خفیہ ہاتھ ہیں، جو نہیں چاہتے کہ مجاہدین کے درمیان مستقل اتحاد کی کوئی صورت پیدا ہو جائے اور یہ مل جل کر دشمن کے خلاف کاروائیاں کریں۔ ان کی یہ کوشش ہے کہ افغانستان میں "متعدد اور متوازن" گروپس ہوں۔ (اس جملے کو دوبارہ دہراتے ہوئے انہوں نے متوازن اور متعدد پہ زور دیا) دراصل اسماء بریگیڈ خالصتاً حزب اسلامی نے ختم کیا تھا۔ اور بعض فرا

بقیہ صفحہ ۲۴ پر

غزلیں

نور الدین انور

زندگی کی راہ میں کلفت ہی کلفت ہیں مگر
زندگی ہے راہ چلتے پھول برسانے کا نام

شور باطل سے دبے کیونکر کبھی حق کی صدا
حق تو ہے شیرازۂ باطل بکھر جانے کا نام

آج یہ انسان ہوا ہے کس قدر باطل پرست
بیچ کر مسجد میں بھی لیتا ہے بکنے کا نام

صاحب ہمت تو ہر لحظہ ہے سرگرم سفر
وہ نہیں لیتا کسی منزل پہ رک جانے کا نام

جان دی ہے شمع پر جل جل کر اس نے رات بھر
صبح کو لیتے ہیں سب حسرت سے پروانے کا نام

موج ہو طوفاں، شرر برسے ہوں کہ تیغ قیصری
عزم دل ہے بے خطر سے گزر جانے کا نام

موت ہے انسان کی گویا اسی غفلت کی روش
زندگی ہے اس کے ذہن و دل کے کھو جانے کا نام

مرد مومن رنج و غم سے [illegible]
قدم [illegible] بھی نہیں لیتا وہ دہرانے کا نام

اے خدا انور کو ہے جب تک تجھ سے امید کرم
تیرے در کو چھوڑ کر وہ لے کہاں جانے کا نام

شفق طاہری

بستیاں چھوڑیں تو صحرا کا سفر ہم کو ملا
دھوپ میں [illegible] انداز نظر ہم کو ملا

کیا وراثت میں [illegible] ہم کو ملا
[illegible] ہم کو ملا

اک پرندہ شاخ گل پر [illegible] نظر ہم کو ملا
[illegible] ہم کو ملا

خاک چاٹیں [illegible] دھوپ کا [illegible] ہم کو ملا
بے حسوں کے ساتھ [illegible] نہیں جیا تا کیا

چلچلیوں میں [illegible] کا گھر ہم کو ملا
روشنی کے شہر میں [illegible] اور دن کو رات ہم

چاندنی کو دھوپ [illegible] نظر آ ہم کو ملا
کیا بتائیں کیا [illegible] انداز [illegible]

سخت زنجیریں پڑی ہیں [illegible] ہم کو ملا
جو بتاتا [illegible] وہ راہبر [illegible]

منزل مقصود کا [illegible] پتھر کا جگر ہم کو ملا
دل ملا [illegible] گھر سے نکلے [illegible] شفق

سنسان [illegible] اپنا گھر ہم کو ملا
ایک مدت سے [illegible] نہ دن میں [illegible]

تعارف و تبصرہ

(ل م)

"مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کا مقام ہندوستان کے علماء میں اس لحاظ سے نہایت ممتاز ہے کہ انھوں نے عمر تو بہت قلیل پائی لیکن تصانیف کی ایک کثیر تعداد یادگار چھوڑی چنانچہ تقریباً صرف ۳۹ سال کی مختصر عمر میں انھوں نے ایک سو سے زیادہ کتابیں تالیف کیں جنہیں سے اکثر کتابیں قبولیت عامہ سے شرفیاب ہوئیں۔ ان کی متعدد تصانیف مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل کی گئیں جہاں وہ اب تک رائج اور متداول ہیں۔"

یہ اقتباس مولانا عبدالحئی فرنگی محلی (۱۸۴۷ - ۱۸۸۶ء) حیات اور خدمات سے ماخوذ ہے۔ مولانا کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ تمام علمی حلقے ان کی حیات و خدمات نیز تصانیف سے واقف ہیں اور استفادہ کر رہے ہیں۔

غلام مرسلین صاحب کی تازہ تصنیف "مولانا عبدالحئی فرنگی محلی حیات اور خدمات" ایک جامع تصنیف ہے جسمیں مولانا کی تصنیف ان کی تعلیم و تربیت، اساتذہ، تلامذہ تصانیف اور خدمات پر مختصر مگر عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ ناظم سنی دینیات پروفیسر محمد تقی امینی علی گڑھ کا خوبصورت پیش لفظ ہے، ۱۹۲ صفحات، سائز ۲۲×۱۸/۸ خوبصورت گیٹ اپ قیمت ۴۰ روپیہ۔ طلبہ، اساتذہ نیز ان تمام لوگوں کے لئے جو مولانا کی زندگی کے بارے میں جاننا چاہیں یہ کتاب مفید ہے۔ طباعت پر اگر توجہ دی گئی ہوتی تو یہ کتاب حسن صورت و سیرت دونوں کے لحاظ سے عمدہ ہوتی۔ ملنے کا پتہ:- مصطفیٰ منزل، لال ڈگی، علی گڑھ۔

٭ ٭ ٭

سیرۃ المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، صفحات ۳۰۴، سائز ۳۰×۲۰/۱۶ مرتب ابن عبدالشکور

امیر المومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی زندگی پر ایک اچھوتے انداز کی گفتگو ابن عبدالشکور

کا شگفتہ قلم اور حضرت علیؓ کی دلنواز گفتگو (نہج البلاغہ) کی روشنی میں۔ عمدہ کتابت اور خوبصورت طباعت قیمت صرف ۹ روپئے۔

سیرت ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ مولف ابن عبدالشکور صفحات ۱۵۱ سائز ۳۰×۲۰/۱۶ قیمت ۱۲ روپئے۔

ام المومنین حضرت زینب کی زندگی خواتین اسلام کے لئے ایک عمدہ نمونہ ہے۔ عورتوں کیلئے یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔ خصوصاً تحریک اسلامی سے منسلک خواتین کے لئے۔

آخری منزل مرتب ابن عبدالشکور، صفحات ۸۰ سائز ۳۰×۲۰/۱۶ قیمت ۶ روپئے۔

انسان کی آخری منزل قبر ہے۔ قرآن و حدیث اور حضرت علیؓ کے فرمودات نہج البلاغۃ کی روشنی میں عمدہ گفتگو۔ ہر ایک کے لئے یکساں مفید اور نصیحت آموز۔

ابن عبدالشکور کا قلم نہایت پختہ اور تحریر نہایت شگفتہ ہے، الفاظ اور جملے ان کے پیچھے ہر وقت قطار در قطار کھڑے رہتے ہیں اور یہ ان کو چن چن کر ادب کی لڑیاں بناتے رہتے ہیں۔ تحریر پختہ ہے مگر خود جوان ہیں۔ ان سے میری ملاقات مکتبۂ اسلامی [illegible] بنگلور میں ہوئی۔ تعارف کے بعد میں نے کہا، میں تو آپ کو عمر رسیدہ سمجھتا تھا، کہنے لگے، مولانا علی میاں ندوی سے ملاقات ہوئی اور تعارف ہوا تو کہنے لگے کہ آپ ہی عبدالشکور ہیں میں تو سمجھا تھا کہ کوئی عمر رسیدہ آدمی ہوگا۔"

ان تینوں کتابوں کے ملنے کا پتہ عارف پبلکیشنز ۹۵ ارناچلم روڈ بنگلور ۵۱

نوٹ:- تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدیں ارسال کریں ورنہ ادارہ تبصرہ کرنے سے معذور ہوگا۔

بقیہ حلقۂ یاراں

میں حیات نو کا مستقل خریدار ہوں اور حیات نو کے تمام پرچے ہمارے پاس موجود ہیں، اس لئے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حیات نو کی ابتک کی تاریخ میں سید حامد حسین نمبر ایک سنگ میل ہے۔ خدا کرے حیات نو ہم کو ہمیشہ حیات نو عطا کرتا رہے، آمین۔

والسلام   ا س م

حلقۂ یاراں

ط۔ س۔

عزیز الدین عزیز

برادر محترم جناب طارق صاحب   ایڈیٹر حیات نو،

سلام مسنون

محبت نامہ نظر نواز ہوا۔ "حیات نو" پابندی کے ساتھ مل رہا ہے۔ حضرت مولانا سید حامد حسینؒ نمبر آفسیٹ کی خوبصورت طباعت سے آراستہ ہو کر ہمدست ہوا تو ایک رفیق کو یہ کہتے پھر اکہ دیکھئے حیات نو کا یہ انداز نو، اور یہ کہ رسالے جب ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں تو ان کے تیور کیا ہوتے ہیں۔ آپ کو مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے دامن میں الفاظ کہاں کہ یہ کام انجام دے سکوں۔ خدائے تعالیٰ نظر بد سے حیات نو کی موجودہ شکل کو محفوظ رکھے۔ واقعی آپنے اس پیشکش کے ذریعہ مرحوم و مغفور مولانائے محترم کو بہترین خراج تحسین و عقیدت پیش کیا ہے۔ جزاک اللہ۔

سال ۱۹۷۰ء کو ہبلی (کرناٹک) اور اطراف کے رفقا کبھی نہیں بھولیں گے۔ اسی "۸۰" سالہ مولانا ایک تربیتی اجتماع میں شرکت کے لئے ہبلی تشریف لائے تھے، اور یہ اجتماع ہبلی سے تقریباً ۸ کیلو میٹر کے فاصلے پر واقع ایک مقام "زراس" میں منعقد کیا گیا تھا۔ ادبی نشست اجتماع کا اہم حصہ تھی جس میں شرکت کے لئے مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا، مولانا توجہ اور انہماک کے ساتھ میرے اشعار سنتے رہے۔ دوران نشست تو انھوں نے کوئی داد نہیں دی جس سے مجھے بحیثیت شاعر مایوسی ہوئی۔ اور یہ خیال ہوا کہ شاید مولانا کو شعر و شاعری میں دلچسپی نہیں۔ لیکن آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ مولانائے محترم میرے اشعار سے کافی حد تک متاثر ہو چکے تھے۔ اس کا اظہار اس وقت ہوا جبکہ مولانا اپنے بعد کے خطاب میں "نظری سیاست اور عملی سیاست" میں فرق واضح کرتے ہوئے میرے اشعار کا حوالہ دیتے

ہوئے کہا کہ اگرچہ ہم عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے لیکن نظری سیاست میں ہم بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں جیسے کہ ابھی آپنے ہمارے شاعر کے اشعار میں دیکھا۔ اور پھر بہت دیر تک اسکی وضاحت کرتے رہے۔ مولانا محمد سراج الحسن صاحب کے ان الفاظ پر میں اپنے مکتوب کو ختم کرتا ہوں

"سید صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن اقامت دین کے میدان میں اپنی جہد مسلسل سے جو نقوش انھوں نے چھوڑے ہیں وہ ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے اور ہم سب کو بھی آخری دم تک اپنے دین کی سربلندی کے لئے سرگرم رہنے کی توفیق دے۔"

مجھے افسوس ہے کہ حیات نو کے لئے کوئی کلام روانہ نہ کر سکا حالانکہ آپ مسلسل یاددہانی کراتے رہے۔ ایک غزل ارسال خدمت ہے امید کہ پسند آئے گی۔ اپنی رائے سے نوازئیے۔

فقط والسلام   عزیز الدین عزیز

برادر مکرم: جناب طارق فارقلیط صاحب

سلام مسنون

حیات نو کا خصوصی نمبر دیکھکر بے ساختہ قلم اٹھ گیا اور جی چاہا کہ آپ کو فوراً مبارکباد لکھ بھیجوں مگر پھر سوچا ذرا اندر بھی دیکھ لوں۔ سید حامد حسینؒ پر کیا کچھ آیا ہے اور کن لوگوں کے ذریعہ آیا ہے۔ یقین مانئے الفاظ میرا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ ہر مضمون اپنی ایک الگ شان رکھتا ہے۔ سید صاحب کو جتنا بہترین خراج عقیدت و محبت حیات نو نے پیش کیا، شاید ہی کوئی پیش کرے۔

آپ کا اداریہ پڑھ کر دل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ آپنے حق ادا کر دیا۔ جاوید احمد خاں کا مضمون، ہمارے حامد حسین، بہت پسند آیا۔ مولانا ابوبکر صاحب کا مضمون، سید صاحب، ایک عظیم قائد عظیم مربی۔ محمود احمد خاں کا مضمون، نرم دم گفتگو گرم دم جستجو، سماج سدھار کیمپ: اسلام کا ایک عظیم نقیب چلا گیا، مسلمانوں کا کوئی سیاسی موقف نہیں۔ ان تمام مضامین نے حیات نو کو گلدستہ بنا دیا ہے اور انٹرویو تو گویا اس پرچے کی جان ہے۔

(بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

جامعہ کے لیل و نہار

نور محمد فلاحی
سکریٹری انجمن

سالانہ امتحان دن بدن قریب آتا جارہا ہے۔ طلبہ تعلیم میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اساتذہ اپنا کورس پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ طلبہ و اساتذہ ہر ایک کی کوشش ہے کہ امتحان کے نتائج عمدہ آئیں۔

سالانہ امتحان ۵ اپریل ۱۹۸۶ء سے شروع ہو رہا ہے اور ۲۳ اپریل کو ختم ہو رہا ہے۔ بچے اسی دن اپنے گھروں کو جا سکیں گے۔

جمعیۃ الطلبہ اس وقت کافی سرگرم ہے۔ مختلف مقابلے تحریری و تقریری ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اول دوم اور سوم آنے والے طلبہ کے نام دیئے جا رہے ہیں۔

مقابلہ قرأت و تجوید شعبۂ حفظ و درجات ثانوی۔

اول صفدر جمال، دوم ابو طالب، سوم عطاء الرحمان

اردو تقریری مقابلہ (درجہ عربی دوم) اول انیس احمد، دوم امان اللہ، سوم تبسم اختر

〃 〃 〃 (عربی اول) اول قیصر پرویز، دوم محمد ادریس، سوم عبد الرب

〃 〃 〃 (ہفتم ششم ثانوی) اول سراج الدین، دوم عطاء اللہ ثاقب سلیم، سوم محمد الیاس خیالی

〃 〃 〃 (درجہ پنجم ثانوی) اول سراج الدین، دوم اظہر مجید کشمیری، سوم محمد اکرام گلفتوی

مقابلہ قرأت و تجوید (عربی اول تا ہفتم) اول جاوید سلطان، دوم نور محمد ببنی، سوم قمر عالم۔

اردو تحریری مقابلہ (فضیلت اول دوم) گروپ A، اول انور کمال صدیقی، دوم مسیح الزماں لاری سوم سرفراز احمد، چہارم قمر اسحاق جماد، پنجم خورشید خاں۔

〃 〃 〃 (گروپ B پنجم و چہارم عربی) اول عبد البر اثری، دوم محمد ادریس نیپالی، سوم ضیاء الدین

〃 〃 〃 (گروپ C عربی سوم) اول احسان اللہ حنیف، دوم عبد الحمید بستوی، سوم ریاض الدین گونڈوی۔